دعوتِ دین کے جدید تقاضے

(بریلوی جماعت کے تناظر میں)

تحریر

محمد ناصر مصباحی

ناشر
مجلس فکر اسلامی رامپور

اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خاں علیہ الرحمہ کا عہد عام ہندوستانیوں اور بالخصوص مسلمانوں کے لیے عبوری حالات رکھتا تھا۔ قومی سیاست، عصری تعلیم اور مسلکی اشتباکات تین بڑے ظاہرے تھے جن میں مسلمانوں کا امتحان ہو رہا تھا۔ اعلیٰ حضرت نے اللہ کے لیے مسلکی چیلنج کو قبول کیا۔ تحفظِ مسلکِ اہلِ سنت کے سلسلے میں اعلیٰ حضرت کی کامیابی دوٹوک ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ حیدرِ زمانہ کی حملہ آوری کے بعد گم راہان اُس ٹریک سے تقریباً اُتر سے گئے جس پر وہ اپنی تحریروں سے چلنے کا عزم ظاہر کرتے تھے۔

لیکن دیگر میدانوں میں نمائندگی ایک مسئلہ بنی۔ یہ میدان سیاسی اور عصری تعلیم ہی کے نہیں، ہر طرح کے تھے۔ بعد کے علمائے اہلِ سنت کے سامنے اِس کمی کا اِزالہ ایک چیلنج تھا۔ دوسرا چیلنج مٹھی بھر گم راہ طبقے کو چھوڑ ملک بھر کے مسلمانوں اور بالخصوص دینی و علمی اداروں اور خانقاہوں کو اعتماد میں لینا تھا۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ ہمیں اِس کی جو وجہ معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ اعلیٰ حضرت کے بعد غیر شعوری طور پر یا ضرورتِ تحفظِ مسلکِ حق کی خاطر خاص رخ پر ذہن بندھ سا گیا۔ یا یہ عمل کچھ نہ کچھ نرمی چاہتا تھا جس کے لیے فطری ذوق اور اجتہادی نقطۂ نظر سے اعلیٰ حضرت روادار نہ تھے مگر بعد میں تکلف سے کام لیا گیا۔ یا بعض چیزیں ایمرجنسی اقدام کے تحت تھیں جنہیں بعد میں ریگولر اور جنرل اصول بنالیا گیا۔

نقصان یہ ہوا کہ ایک ذرا احتیاط نہ چھوڑنے کی کوشش میں فتنہ بڑھ گیا۔ شومیِ قسمت کہ جو کمی عہدِ اعلیٰ حضرت میں رہ گئی تھی اور بعد والوں کے لیے چیلنج تھی وہ آج بھی ایک بڑے چیلنج کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے۔

Rs. 50/=

MADRASA MAHAD-E-ISLAMI
Hazratpur, Topkhana Gate, Rampur-244901, U.P. (India)
Managed by: Majlis-e-fikre Islami
Hazratpur, Topkhana Gate, Rampur-244901, U.P. (India)
E-mail:nasirrampur@gmail.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دعوتِ دین کے جدید تقاضے

(بریلوی جماعت کے تناظر میں)

تحریر

محمد ناصر مصباحی

ناشر

مجلس فکر اسلامی

حضرت پور، توپ خانہ گیٹ، رامپور۔ یو۔ پی۔ انڈیا۔ پن: 244901

جملہ حقوق بہ حقِ ناشر محفوظ

نام کتاب: دعوتِ دین کے جدید تقاضے (بریلوی جماعت کے تناظر میں)

تحریر: محمد ناصر مصباحی

صفحہ آرائی: مزمل حسین رضوی، جمالی کمپیوٹر، رامپور۔

صفحات: 80

تعداد: گیارہ سو

سنِ اشاعت: نومبر 2014ء

ناشر: مجلس فکر اسلامی، حضرت پور، توپ خانہ گیٹ، رامپور، یوپی۔ (انڈیا)۔

Email:nasirrampur@gmail.com

ملنے کے پتے:

مررسہ معہدِ اسلامی، حضرت پور، توپ خانہ گیٹ، رامپور۔

ادبستان بک ڈپو، بازار نصر اللہ خاں، رامپور۔

مشمولات

☆ پیشِ لفظ
(1) دورِ جدید: ایک خوش گوار چیلنج
(2) دعوتِ دین کے جدید تقاضے
(3) صاف گوئی کا تقاضا کرے ایماں مجھ سے

انتساب

ہر اُس فردِ مومن کے نام جو دین و سنیت کا حقیقی درد رکھتا ہے

محمد ناصر مصباحی

پیش لفظ

بلاشبہ اسلام ہی دینِ حق ہے۔ ہمیں اُسی پر چلنا، اسی کی دعوت دینا ہے، اسی پر جینا، اسی پر مرنا ہے۔ لیکن موجودہ حالات میں ہم اپنی ہی قوم کے بعض رویوں سے سخت دکھی ہیں، حالاں کہ امید کی طاقت ور کرنیں بھی پھوٹ رہی ہیں۔ ہمارے خیال میں پچھلی ڈھائی تین صدیوں سے عالمی سطح پر مسلمانوں کے ذہن وفکر کے رجحانات بلکہ اخلاقیات تک پر خاص اثر پڑا ہے جس سے اہلِ علم تک محفوظ نہ رہ سکے۔ عہدِ حاضر میں جب کہ مغرب ترقیوں پر ہے، کیا بے علم عوام، کیا اہلِ علم خواص، ہم ایک برھم اور بے جہتی کا شکار قوم بن کر رہ گئے ہیں۔

آج عالمی سطح پر داخلِ امتِ مسلمہ مختلف اہداف اور رجحانات کی تحریکیں سرگرم ہیں جو قوم کی بیدار ذہنی کی علامت ہیں، مگر افسوس! عملاً سخت قتل وغارت گری چل رہی ہے، مزید یہ کہ مسلکوں کے نام پر تکفیریت بحال کر لی گئی ہے۔ آج عالمِ اسلام پر وہابیائی تحریک کے اثرات صاف دیکھے جاسکتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ اگر آپ دین وملت کی فلاح چاہتے ہیں تو بعض شدید فکری بے راہ روی کے ترک کے ساتھ عدمِ برداشت کی شدت کم کرنا ہوگی، آخر اِحیاے دین واصلاحِ امت کی بے تکی کوشش میں خود کو ایک گُم راہ فرقہ بنانا تو آپ کا مقصد نہیں۔ یہی حالت ہمارے ہند وپاک کی ہے، دیوبند اور بریلی کے جھگڑوں نے عام مسلمانوں کو سخت مضطرب کر رکھا ہے۔ ہمیں معلوم ہے بعض اختلافات سنگین ہیں مگر کیا اُن کے حل نہ ہونے پر اللہ نے مہر کر رکھی ہے۔ دراصل ہر دو طرف سے صرف تفریق کی کوششیں کی جارہی ہیں۔ نفسیات ایسی بنا رکھی ہے کہ کچھ لوگ اللہ کے اسلام سے آزاد ہو سکتے ہیں، اپنی نفسیات سے نہیں۔ بخدا! اِن منفی جھگڑوں نے اسلام اور مسلمانوں کو آگے بڑھ کر دنیا کی رہ نمائی کرنے سے روک رکھا ہے۔

جماعتِ اہلِ سنت ہند وپاک کا متعارف علمی حلقۂ بریلی یقیناً راسخ العقیدہ ہے۔ مگر نہ جانے دو تین دہائیوں سے اسے کس کی نظر لگ گئی۔ یہ حلقہ آج دو دھڑوں میں تقسیم ہے: اصلاح پسند وتعمیریت کا قائل- سخت گیر ودقیانوسیت کا حامل۔ کہا جاتا ہے کہ اگر سارے لوگ مل کر چھپر چڑھائیں اور ایک شخص روکنے لگے تو کسی صورت نہیں چڑھ سکتا۔ یہی حالت آج اِس حلقے کی ہے۔ کچھ لوگ اپنے حصے کا کام چھوڑ کر دوسروں کی ٹانگ کھینچنے میں لگے ہوئے ہیں۔ ردوقدح پر اخلاق سے پرے کتابیں تحریر کی جارہی ہیں۔ شدت پسندی عروج پر ہے۔ گالی گلوچ کو ذوق اور تخریب کو مقصد بنالیا ہے۔ کفر و اسلام کے تیز تر فیصلوں کو دیکھ کر لگتا ہے جیسے نفسانیت کے نئے خدا تخلیق دے رکھے ہوں کہ اللہ و رسول کے بجاے اُن کا انکار واقرار کفر واسلام ہے۔ کاش یہ لوگ مولانا ابوالاعلی مودودی اور مولانا وحید الدین احمد خان کے اندازِ اختلاف سے درس لیتے، کاش یہ لوگ **تعبیر کی غلطی** پڑھ لیتے!

یہ سارا آتنک دیکھ کر ہم جس نتیجے پر پہنچے ہیں وہ یہ ہے کہ گروہی تحفظات سے یک سر اُوپر اُٹھ کر سوچا اور کام کیا جائے۔ مثبت سوچ اور خداترسی اختیار کی جائے، دھاندلی کسی صورت برداشت نہ کی جائے۔ اصولوں سے ہٹا نہ جائے، فروع کو حدوں میں رکھا جائے۔ ایمانی جرأت اور عزم وحوصلہ سے کام لیا جائے۔

حلقۂ بریلی کے داخلی اختلافات کا بظاہر محور فروغِ سنیت کی حکمت ورعایت ہے۔ ہم سخت گیر دھڑے کے جملہ افراد کی نیتوں پر شبہ نہیں کرتے، مگر یہ طبقہ سخت غلط فہمی کا شکار ہے اور مقصد سے بری طرح بھٹک گیا ہے جس کی کڑی رہ نمائی کی ضرورت ہے۔ کیا خطائیں چل رہی ہیں جن کا ازالہ ضروری ہے اور کیا missings بے اعتنائی کا شکار ہیں جن کو اختیار کرنا وقت کا ناگزیر تقاضا ہے۔ اِس کی دوٹوک وضاحت کا وقت آ پہنچا ہے۔

پیشِ نظر کتاب **''دعوتِ دین کے جدید تقاضے''** اِسی مقصد کے حصول کی ناتمام سی سعی ہے۔ کتاب دراصل تین مستقل مضامین کا مجموعہ ہے جس میں کسی ایک کے عنوان کو عنوانِ کتاب بنا دیا گیا ہے جو دیگر مضامین کے مواد سے بھی میل کھاتا ہے۔ یہ روایت اُردو ادب میں نادر نہیں۔ تحریر کو جواب آں غزل اور کسی طرح کی ذاتیات سے یک سر پاک رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہمیں موقف پر شرحِ صدر ہے نتیجتاً قطعیت کے ساتھ تحریر قلم بند کی گئی ہے۔ ضرورت محسوس ہوئی تو مزید لکھنے کا عزم ہے۔ بعض پہلو خالص علمی وتاریخی طریقے پر تفصیلاً واضح کیے جاسکتے ہیں۔ بشری تقاضے کے تحت ممکن ہے کتاب میں کہیں کسی قسم کا سہو در آیا ہو۔ اِس کے لیے نشان دہی کی درخواست ہے۔

از: **محمد ناصر مصباحی**

مدرسہ **معہدِ اسلامی**، حضرت پور، توپ خانہ گیٹ، رامپور۔ 5/نومبر 2014ء بروز بدھ

email:nasirrampur@gmail.com

www.facebook.com/nasirrampurimisbahi

(1)

دورِ جدید: ایک خوش گوار چیلنج

علم و تحقیق کا دور

دورِ جدید اپنے آپ میں ایک پیچیدہ دور بھی ہے اور دوٹوک کلیئر بھی۔ یہ دور علم و تمدن سے بھرپور ہے۔ انسان ترقی کی چوٹی پر ہے، مگر سچ پوچھیے تو امکانات کا بگولا بھی اِسی دور میں روشن ہوا ہے۔ انسان کی دنیاوی ترقی کا تسلسل بتاتا ہے کہ آگے کتنی اور کیسی ترقی ہو، نہیں کہا جاسکتا۔ آج بھی دنیا ہر دن نئے انکشافات کر رہی ہے۔ جو سوچا نہیں جاسکتا وہ گرفتِ ہمتِ انسان ہو رہا ہے۔ اِس سے دو چیزوں کا اندازہ ہوتا ہے، ایک انسان کی عظمت کا، دوسرے اللہ کی کائنات میں وسعتوں کے انبار کا۔

مگر یہ انسان کی خودرہ نمایانہ کاوشیں ہیں، وہ اپنی طاقتِ فکر و عمل جو خالقِ حقیقی نے عطا کی ہے، استعمال کر کے تماشائے قدرت دیکھ رہا ہے، پھر نتائج دیکھ کر آگے بڑھ رہا ہے۔ اُسے منزل نہیں پتا، وہ تجربات کے سہارے اگلی منزلیں طے کر رہا ہے۔ چوں کہ وہ تمام تر محاذات پر ناکام نہیں، اِس لیے اُس کے اندر ایک عزم جاگا ہوا ہے کسی بھی چیز کی اصل تک جانے اور حل نکالنے کا۔ کھوج کہاں تک کی جاسکتی ہے، یہ بھی ایک سوال ہے جو حل طلب ہے۔ یہ آسمان پر تارے، یہ سیارے سب کیا ہیں، کیوں ہیں، خواص کیا ہیں، جیسے سوالات پر انسان کی مسلسل کھوج چل رہی ہے۔ آج کل انسان اِس میں لگا ہے کہ اگر دنیا ایک بڑے دھماکے سے وجود میں آئی تو کیوں آئی۔ وہ اِس کے حل میں بھی دل چسپی رکھتا ہے کہ خود انسان کی روح اور عقل و دل کیا ہے، موت و حیات کا مطلب کیا ہے۔

خالص آزاد دور

دورِ جدید کو مادیت کا دور کہا جاتا ہے، بالخصوص اہلِ مذاہب اِس کو دورِ خدا بیزاری کہتے ہیں مگر ہمیں اِس حکم میں ذمے داری سے فرار محسوس ہوتا ہے۔ دراصل دورِ جدید ایک خوش گوار چیلنج ہے۔ جسے قبول کیا جانا چاہیے۔ دورِ جدید میں عصبیت بہت مستحکم ہے مگر علم و تحقیق بھی اِس کی شناخت ہے۔ آج تہذیبی کشمکش بھی ہے مگر اعترافِ حقائق کے ولولے بھی ہیں۔ انسان مادیت میں غرق ہے مگر آغوشِ فطرت کا متمنی بھی ہے، مادیت کی ترقی کے ساتھ روحانیت پسندی بھی روز افزوں ہے۔ انسان خزائنِ دنیا کی چمک دمک میں محو ہے مگر فطرت بیزار بھی ہو رہی ہے۔ دراصل اس زمانے میں بندشیں ٹوٹ گئی ہیں۔ نہ کچھ ممکن رہا ہے، نہ کچھ غیر ممکن۔ قطعِ نظر مثبت و منفی، دنیا اپنے بے تحاشا امکانات کے ساتھ عروج کو پہنچ گئی ہے بلکہ عروج در عروج کا سلسلہ جاری ہے جس کی دَین ہے کہ آج بہت کچھ اچھا ہو یا بُرا، روایتی اندازوں کے برخلاف ہو رہا ہے۔ سچ یہ ہے کہ یہ خالص آزاد دور ہے۔

ہاں اِس بڑھتی چڑھتی دنیا میں اہلِ حق کی ذمے داریاں بہت بڑھ جاتی ہیں۔ دنیا خود رو ہے، مگر ضروری نہیں کہ ہر عمل میں بے راہ رو ہے مگر جہاں بے راہ رو ہے، وہاں اُسے رہ نمائی کی ضرورت ہے۔ یقینا دنیا میں بھٹکنے کے امکانات بڑھے ہیں مگر ہدایت کے بواعث سے بھی دنیا مملو ہے۔ آج بہت سے لوگ الگ میدانوں کے ذاتی تجربات سے حق کے قائل ہو جاتے ہیں۔ پھر آج انفورمیشن کی دنیا ہے، اہم بات یہ ہے کہ کچھ چھُپایا نہیں جا رہا ہے یا چھپایا جانا ممکن نہیں رہا ہے۔ جو شخص جس میدان کی معلومات حاصل کرنا چاہے، حاصل کرسکتا ہے۔ ایسے میں اہلِ حق دو طرح سے نہایت ایڈوانس سطح سے مترشح ہونے والی بے راہ روی کو روک سکتے ہیں، ایک یہ کہ کچھ لوگ خود اُس میدان میں عملی طور پر جالگیں، دوسرے اُس میدان کی اسپیشل اسٹڈی کریں اور اِس طرح لوگوں کو وہاں کی سچائیوں سے آگاہ کریں اور گمراہ ہونے سے بچائیں۔ غرض ہمیں کسی بھی فیلڈ میں ذاتی اطمینان حاصل کرنا چاہیے۔

اسلام کی صحیح نمائندگی بڑا چیلنج

ہم براہِ راست اسلامی نقطۂ نظر سے گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ ہماری نظر میں اسلام ایک ایسا مذہب اور ایک ایسی تھیوری ہے جسے زمانہ چیلنج دینا چاہتا ہے۔ یہ اسلام کی طاقت کا اشاریہ ہے۔ مگر چیلنج اسلام کے سامنے نہیں، اہلِ اسلام کے سامنے ہے۔ اسلام اپنی بے تحاشا طاقتِ حق کے ساتھ اِس سے بے نیاز ہے کہ براہِ راست اُسے کوئی چیلنج دے سکے۔ ہم اسلام اور دنیا کی کشمکش پر غور کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ہمیشہ اہلِ اسلام چیلنج سے متصادم رہے ہیں۔ یہاں سوال یہ ہے کہ وہ چیلنج کیا ہے۔ ہماری نظر میں سرسری چیلنجز میں دعوتِ اسلام اور اُس کے بعد دفاعِ اسلام ہے مگر اصل چیلنج جامع نمائندگیِ اسلام ہے، یعنی اسلام کی صحیح تفسیر و تشریح، یعنی وہ کیا ہے، کیا کہتا ہے۔

ہمارے پاس اِس کی دلیل یہ ہے کہ فطرتِ انسانی کے لیے دیر یا سویر سچائی سے فرار ممکن نہیں، تاہم فرار مسلسل موجود رہا ہے۔ دوسرے ہمیں لگتا ہے کہ اسلام کی مقتضائے حال کے مطابق وقتی تشریح کی جاسکتی ہے مگر generally اِسلام کی تشریح و تعبیر تمام تر تاثرات سے پاک ہونا چاہیے۔ کسی

طرح جذباتِ طبع، تجرباتِ عمل، تعصّباتِ نفس وغیرہ کا عمل دخل نہ ہو۔ عموماً ہو یہ جاتا ہے کہ دیگر ضروری پہلو دب جاتے ہیں جب کہ جس پر توجہ مرتکز ہے، اُس میں فراوانی آجاتی ہے۔ طبعی یا تجرباتی یا مقصدی رجحانات کے زیرِ اثر سختی اور نرمی کے احساسات بھی تعبیر وتشریحِ اسلام میں دخل انداز ہوجاتے ہیں۔ حالاں کہ اسلام کی بنام اسلام تفسیر میں طبعی انفعالات اور مناظرانہ جذبات کے لیے گنجائش نہیں ہونا چاہیے۔

نمائندگی کے نام پر گھماسان

ہمیں حال کے آئینے میں ماضی کے حالات کا احساس ہوتا ہے، حال ماضی سے کلیتاً بے نیاز نہیں ہوتا بلکہ اُس کی آئینہ داری کرتا ہے۔ ہماری نظر میں آج اسلام کو سب سے زیادہ ضرورت اُس کی صحیح نمائندگی کی ہے اور اُس کے فروغ اور ترویج وترقی کی راہ میں نادرست نمائندگی ہی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ ہم آج نظریاتی جذبات کا گھماسان دیکھتے ہیں اور اُس میں اِفراط وتفریط۔ اچھے کاموں سے دنیا کبھی خالی نہ رہی، نہ اچھے لوگوں سے مگر آج جو کمزوری عروج پر ہے وہ نمائندگی کے نام پر چوطرفہ ہمہ ہمی ہے۔ ایک عامی کے لیے دشوار ہے کہ وہ فہمِ اسلام کے لیے کس طرف رخ کرے۔ ہمارے عملوں نے مزید کنفیوزن پیدا کیا ہے۔ یہ دوطرح کے ہیں، ایک اسلامی حکم کے نام پر کیا جارہا ہے، دوسرا کوتاہ عملی کے طریقے پر۔ دونوں باعثِ تشویش ہیں۔

علمی وفکری سطح سے نمائندگی کی ضرورت

آج اسلام کی نمائندگی کے خواہاں بہت سے نئے محاذات سامنے آئے ہیں، یہ وہ محاذات ہیں جہاں خود پہنچ کر اسلام کی ترجمانی اور نمائندگی کرنا ہے۔ سیاسی، سماجی، اخلاقی، معاشی میدانوں میں نئے نئے شعبہ جات تخلیق پا رہے ہیں، طبیعی سائنس بے تحاشا ترقی کے ساتھ اپنی شاخ در شاخ قائم کررہی ہے۔ اِن سب جگھوں پر بہ قدرِ ضرورت اسلام کا نقطۂ نظر واضح کیا جانا اور یہ بتانا ضروری ہے کہ یہاں اسلام کیا رہ نمائی کرتا ہے۔ آج کہا جاتا ہے کہ نئی نسل میں دین بیزاری آرہی ہے، زمانہ الحاد کی زد میں ہے۔ لیکن اصل یہ ہے کہ بہت سے ضروری مقامات پر بروقت اسلام کی رہ نمائی نہیں پہنچ پاتی، نتیجتاً خود رو دنیا کچھ نہ کچھ مفروضے تیار کرلیتی ہے، اُن میں بہت سے مفروضے وہ ہوتے ہیں جو اسلام مخالف نہیں ہوتے یا جن کے اشارے اسلام پہلے کرچکا ہوتا ہے مگر لوگ اُنہیں تجربات کے

راستے حاصل کرتے ہیں، اِس لیے وہ اسلام کے نام پر قبول نہیں کیے جاتے بلکہ بسا اوقات اسلام مخالف تصور کرلیے جاتے ہیں اور ہمیں اُن کی بعد میں تطبیق یا تصدیق کرنا پڑتی ہے۔

دنیا شعوری طور پر مذہب دشمن نہیں

خاص آج کی دنیا شعوری یا متعصّبانہ طور پر مذہب دشمن نہیں۔ اُسے اِتنی فرصت کہاں کہ کسی سے دشمنی کرے، مگر وہ اپنا نقصان نہیں چاہتی۔ دین سے اُس کی بیزاری بایں طور شروع ہوتی ہے کہ وہ جس میدان میں قدم رنجہ ہورہی ہے، وہاں اُسے دین کی ضرورت نہیں پڑ رہی ہے۔ ضرورت نہ پڑنے کی وجہ یہ ہے کہ اُس پر جتنا دین واضح ہے، وہ صرف چند روایات ہیں جو رہ نمائی کے لیے قطعی ناکافی ہیں۔ یہ مطلب نہیں کہ اُسے کسی جگہ کسی نوع کی مشکلات کا سامنا نہیں جس کا وہ حل نہیں چاہتی بلکہ وہ حلِ مشکلات کے لیے دین کو اپنی معلومات کی رو سے ناکافی تصور کررہی ہے۔ لہٰذا آج اہلِ دنیا کے لیے سرگرم شعبہ ہائے زندگی میں دین کی ہدایت کو واضح کیا جانا ضروری ہے۔

یہ دو طریقے پر ہوسکتی ہے، ایک یہ کہ مباح ترقی کو قدرتی امکانات سے تعبیر کر کے تخفیفِ ذمے داری کی جائے یعنی یہ کہ یہ امکانات بلکہ اِس بھی زیادہ خالقِ حقیقی نے کائنات میں رکھے ہیں تاکہ خلیفۃ اللہ فی الارض یعنی حضرتِ انسان اپنی صلاحیتوں کا زیادہ سے زیادہ استعمال کرے اور اِس طرح وہ خود کی عظمت اور خالقِ کائنات کی قدرت کو پہچانے۔ دوسرے وہاں جو غیر اسلامی خیالات جنم لے رہے ہیں اُن کی کمزوریاں اُجاگر کر کے متبادل طریقے پر صحیح اسلامی نقطۂ نظر کو نمائندہ بنا کر پیش کیا جائے۔ خلاصہ یہ کہ آج دعوتِ دین سے بڑھ کر دین کی حقیقت وہدایت عام کرنے کی ضرورت ہے۔ زمانے کا بڑا چیلنج یہ ہے کہ اسلام کی ترجمانی دورِ حاضر کی علمی وفکری سطح سے کی جائے۔ آج اِس ضرورت سے کہ آؤ دین کی طرف، زیادہ ضرورت اصل وحقیقی دین واضح کرنے کی ہے۔ جب کہ ہمارا حال یہ ہے کہ جہاں سے الحاد مترشح ہو رہا ہے وہاں اسلام کو متعارف نہیں کرا پا رہے ہیں۔ اس سلسلے میں قدمائے اسلام کے مثالی کردار سے روشنی حاصل کی جاسکتی ہے۔ قدمائے اسلام نے اپنے عہد کے زندہ اور سرگرم چیلنجز کو سمجھا اور جس بلندی تک دنیا گئی اُس بلندی تک اُنہوں نے اسلام کی ترجمانی کی اور زمانے کے علمی اور فکری ذوق کے مطابق کی۔

مفادِ اسلام کے لیے متحد ہونا ضروری

کاش آج دنیاے اسلام مفادِ اسلام کے لیے کسی درجے میں مشترکہ جذبات کا اظہار کرے اور ذہن وفکر پر جمے تھکن کے اثرات صاف کر کے خود کو بڑے اَہداف کے لیے خالص کرلے۔ وہ اِس پہلو سے غور کرے کہ آخر انسانی دنیا کا نصف سے زائد حصہ مسلسل غیر مسلم کیوں رہا جارہا ہے۔ دنیا میں اطمینان بخش ترویجِ اسلام کے لیے امت کو چودہ سو سال کا کم عرصہ نہیں ملا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ انسان دینِ فطرت، بلفظِ دیگر فطرت سے متحارب ہے۔ رہا یہ کہنا کہ ہمیں اپنی کمزوریاں تسلیم مگر دنیا کے سامنے ہمیشہ عینِ کلامِ خدا موجود ہے، درست نہیں۔ کیوں کہ باطل اتنا کمزور نہیں، وہ سخت گمراہ گر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فیصلہ کن مراحل پر اگرچہ زک کھاتا رہا ہے مگر مجموعی طور پر اُس نے آغازِ نوعِ انسانی سے آج تک ہار نہیں مانی ہے اور تا صبحِ قیامت حق سے مزاحم رہے گا۔ مزید ہم دیکھتے ہیں کہ نزولِ قرآنِ مجید کے ساتھ شارحِ اسلام علیہ السلام کی بعثت ہوئی، پچھلے اَدوار میں صحائف مع پیغمبران کا نزول ہوتا رہا ہے، جب کہ نبی آخرالزماں نے یہ فرما کر کہ میری اُمت کے علماے اسلام انبیاے بنی اسرائیل کی مانند ہیں، علماے اُمت کو اِس بات کا احساس کرایا ہے کہ خالقِ کائنات کی مشیت کیا ہے۔ خالقِ کائنات چاہتا تو دنیا میں صرف اسلام رہتا مگر اُس نے حق و باطل کی کشمکش تخلیق کر کے اہلِ حق کو فیصلہ کن رول ادا کرنے کا حکم دیا تاکہ وہ اُنھیں جانچے اور کامیاب لوگوں پر اپنے انعامات کا نزول کرے۔

علمی حلقے تحقیق کی فضا تخلیق کریں

سوال یہ ہے کہ اسلام کی عظیم نمائندگی کے سلسلے میں گراوٹ کیسے آئی۔ ہم ماضی اور حال کے علما کی دینی خدمات کے بلند و پست معیارات پر تنقیدی نظر ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ خرابی کی بڑی وجوہات میں تقلید پر ضرورت سے زیادہ انحصار یا اُس کا غلط تصور ذہن میں بٹھا لینا ہے۔ تقلید دراصل عجز کا دوسرا نام ہے، اِس کا یہ مطلب نہیں کہ تقلید پر مجبور کیا جائے یا مسرور رہا جائے۔ تقلید حیز غیر طبعی ہے جس میں مسلسل قرار ممکن نہیں مگر یہ کہ عرضِ عارض کی وجہ سے۔ جب کہ آج تھکی طبیعتوں نے اُسے حیز طبعی تصور کر رکھا ہے۔ تقلید کی تعریف میں ''دلائل میں نظر کیے بغیر'' یا ''تفصیلی دلائل میں نظر کیے بغیر'' کی قید لگائی جاتی ہے۔ جس کا عموماً غیر رسمی مطلب یہ ذہن میں بٹھا لیا گیا کہ نظر کی ضرورت نہیں یا محض سرسری نظر ڈال لی جائے۔ حالاں کہ یہ صرف عدم القدرۃ عن النظر سے مشروط ہے۔ غلط مفہوم خیال کرنے کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم اصل یا تفصیلی دلائل پر خالص عدمِ دلچسپی سے اِس جہت سے نظر ڈال لیتے ہیں کہ وہ سابق میں کی جاچکی تحقیقات کے دلائل ہیں، نہ کہ اِس جہت سے کہ مستقل طور پر دیکھیں کہ یہ آیات ونصوص کیا ثابت کرتی ہیں۔ حال کے اِس ذوق کو بدلنے کی ضرورت ہے، تاکہ ذی علموں کی اُولوالعزم طبیعتیں اعتماد ویقین سے لبریز ہو کر کسی قدر تخلیقی کام کی طرف متوجہ ہوسکیں۔

ضمناً عرض کروں کہ ایک ذوق اِس احساس کے ساتھ عموماً مسائلِ فقہیہ پر انحصارِ تحقیق کا بنا کہ یہی زیادہ ضروری ہیں۔ حالاں کہ قرآن مجید کی ہر رہ نمائی برابر اہم اور ناگزیر ہے۔ ہمارا احساس یہ ہے کہ دینِ حقیقی اور خالقِ حقیقی کے مختلف الجہات بڑے concepts قلیل الدراسۃ آیات، اَمثال وحکایات ہی سے زیادہ واضح ہوتے ہیں اور حق و باطل کے اصل فوائد ونقصانات اور شرائعِ دینی کے حقیقی رموز واسرار اِنھیں آیات سے زیادہ روشن ہوتے ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ دیگر آیات ونصوص مثل متونِ قواعد ہیں جب کہ یہ آیات ونصوص مثل تفصیلی دلائل۔ چوں کہ دورِ جدید کا اصل مقتضی بھی دلائل ومعقولیت ہے، بایں غرض جملہ آیات ونصوصِ کتاب وسنت پر ازحد برابر توجہ کی ضرورت ہے۔ کاش اہلِ نظر توجہ فرمائیں!

اہلِ حق کے لیے داخلی چیلنجز

اہلِ حق کے لیے داخلی سطح پر بھی چیلنجز رہے ہیں، یہ ہیں ضلالت وگمراہی کے چیلنجز۔ یہ ایک مشکل مرحلہ ہے، یہ کیسے طے کیا جائے کہ نفسِ شے کی ترجمانی کے دو دعوے داروں میں حق کس طرف ہے۔ اسلام نے داخلِ اسلام ایک حد تک حقِ اختلاف دیا ہے مگر وہ حد کیا ہے۔ کیا یہ کیا جاسکتا ہے کہ خود کو حق پر یقین کر کے مدعیانِ اسلام کے جملہ اختلافات کو خدا کے سپرد کردیا جائے اور کسی طرح کی حمایت ومخالفت سے بے تعلق رہا جائے۔ بہ حیثیتِ ضابطہ یہ بھی عندالاسلام مسلم نہیں ورنہ منکرینِ زکوۃ سے صحابہ جنگ کیوں کرتے، منکرین نے مطلق اسلام سے بے نیازی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ یہ ایک چیلنج ہے۔

ہمارا جہاں تک ذہن کام کررہا ہے وہ یہ ہے کہ بعض قطعی اشارے حق کی شناخت کی طرف رہ نمائی کررہے ہیں۔ مثلاً اسلام کا دینِ فطرت ہونا، امتِ مسلمہ کے سوادِ اعظم کا حق سے کبھی نہ بھٹکنا، اللہ کا اُس چیز کو پسند کرنا جس کو عام مسلمان پسند کرلیں وغیرہ۔ داخلِ اسلام اختلافات ہوئے، گمراہ خیالات بھی سامنے آئے، مگر اولاً وہ مرورِ ایام کے ساتھ سخت پیچیدگی کا شکار ہوگئے جس کا مطلب ہے

کہ باطل بہت حد تک اپنے آپ کو سلامت نہ رکھ سکا۔ مزید جہاں اُن میں بعض خیالات واقعی کفر یا ضلالت تھے، وہیں غلط فہمیاں بڑھیں، جو جلد ہی نفرتوں میں بدل گئیں، اُن کے تعاقب میں بعض حضرات کی طرف سے طبعی جذبات کی آمیزش نے اُسے مزید حاملِ شناخت اور ضدی بنا دیا۔ پھر جب دوریاں بڑھتی ہی چلی گئیں تو ہر طبقے سے کچھ ایسی چیزیں سرزد ہوتی چلی گئیں کہ مدِ مقابل کے پاس اُس کے خلاف وہ ثبوت اور دلائل بن گئے۔

داخلی اختلافات سخت پیچیدگی کا شکار

دورِ حاضر کے داخلی اختلافات مزید حیرت ناک ہیں۔ ایک جنگ ہے جو داخلی سطح پر جاری ہے۔ مگر ہمیں لگتا ہے کہ پیچیدگی زیادہ ہے یا پھر یہ بھی مت کہیے اور دور کھڑے تماشا دیکھیے۔ یقیناً دیر و حرم کی جنگ ہے مگر ظاہرہ یہ ہے کہ افراد آپس میں بے ہنگم گتھم گتھا ہیں۔ بلکہ تصادمات سے تھیوری ہی گنجلک سی ہوگئی۔ یا خدا معلوم! صاف ہو رہی ہے۔ ہمیں معروف قطری سلفی عالم ڈاکٹر محمد یوسف قرضاوی کا مقولہ یاد آتا ہے کہ میں چاہتا ہوں صوفی سلفی ہو جائیں اور سلفی صوفی ہو جائیں۔ سوال یہ ہے کہ ہم جسے یقیناً سلفی عالم کہہ رہے ہیں وہ یہ کیا فلسفہ دے رہا ہے۔ دارالعلوم ندوۃ العلما (لکھنؤ) ہندو پاک میں وہابیائی تحریک کا حصہ تصور کیا جاتا ہے مگر بکثرت صوفی سنی علمائے عرب اُسے معتدل المزاج سنی ادارہ تصور کرتے ہیں۔ برصغیر کے تناظر میں زلزلہ از علامہ ارشد القادری کا مطالعہ مزید حیرت میں ڈالنے والا ہے۔ یقیناً سر دھننے کا مقام ہے۔

فرقہ سازی کا دوسرا بڑا سبب غلط فہمی

ہمارے خیال میں فرقہ سازی کا دوسرا سب سے بڑا سبب غلط فہمی ہے۔ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہمارے پیغمبرِ آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی پیش گوئیاں یہودیوں کی کتابوں میں بھی ملتی ہیں، عیسائیوں کی کتابوں میں بھی، زَرتُشتوں کی کتابوں میں بھی ملتی ہیں، بت پرستوں کی ویدوں میں بھی، مگر اِس کے باوجود یہ لوگ اپنے سابقہ طریقے پر جمے رہے یا آج بھی جمے ہوئے ہیں۔

ہم داخلی سطح پر دیکھیں۔ خارجیت، رافضیت، اعتزال اور جدید دور میں وہابیت وغیرہ سب قرآن و سنت پر ایمان کے دعوے دار ہیں مگر اِس کے باوجود آپس میں شروع ہی سے قلم ہی نہیں، تلواریں تک کھنچی رہی ہیں۔ یقیناً شاطرانہ ذہنیتیں فتنے اُٹھاتیں ہیں، مگر یہ بھی ضابطۂ کلی نہیں، مزید لاکھوں لاکھ لوگ فتنہ پسند اور شاطر بن جائیں، یہ مشکل ہے۔ ہم اِس پہلو پر بھی غور کریں کہ ہر طبقے میں بڑی تعداد مخلصین کی ہوتی ہے، وہ اپنے موقف و مسلک یا دین و مذہب کو حق ہی سمجھ کر اُسے مانتے ہیں۔ اُن کے اندر اِس بات کا مضبوط جذبہ ہوتا ہے کہ وہ حق بات بلا جھجک قبول کر لیں گے۔ مگر اِس کے باوجود غلط راہ پر مطمئن ہیں۔ ظاہر ہے اِسے شرارت نہیں، غلط فہمی ہی کہا جا سکتا ہے۔

بظاہر شرارت پسندی کے نتیجے میں ہم دیکھتے ہیں کہ ہر گروہ اپنے موقف و مسلک کی تائید و حمایت والی آیات و نصوص پر ضرورت سے زیادہ اصرار کیے رہتا ہے جو ہر گروہ کی نفسیات ہے۔ ہم ہندو پاک کے سلفی حضرات کو دیکھیں کہ جن مسائل میں اختلاف رکھتے ہیں اُن سے متعلق احادیث ازبر ہوں گی، باقی کے بارے میں صرف ایک ضابطہ رٹ لیتے ہیں کہ ضعیف ہیں۔ دیوبندی حضرات ردِ شرک و بدعت والی آیات و احادیث زبان زد کیے رہتے ہیں، باقی عظمتِ بزرگانِ دین سے متعلق سارے حوالہ جات پسِ پشت ڈالے رہتے ہیں۔ حلقۂ بریلی میں بھی یہی ہے کہ حضراتِ انبیا علیہم السلام و اولیا رضی اللہ عنہم سے متعلق عشق و محبت اور غیر اہلِ سنت کے ساتھ مقاطعہ و شدتِ سلوک کو روا رکھنے والی آیات و عبارات حفظ ملتی ہیں، باقی ساری چیزوں کے لیے تاویلات کر لی جاتی ہیں۔

مگر یہ خالص شرارت، غلط فہمی کا روپ بایں طور دھارتی ہے کہ کھلے ذہن کے بجائے مسلسل خاص رخ پر بندھے ذہن سے پڑھنے، سوچنے کے نتیجے میں ہر گروپ کی ایک متعصب نفسیات بن جاتی ہے اور غیر شعوری طور پر وہ اُسے تعصب کے بجائے خالص دیانت داری اور انصاف پروری تصور کرنے لگتا ہے۔ یہ خواص کی بات ہے۔ رہے عوام تو اُنہیں معلومات ہی مخصوص پہنچائی جاتی ہیں جسے وہ کل دین تصور کرنے لگتے ہیں۔ مسلمانوں میں موجود بے قابو مسلکی گروپ ازم بہت حد تک اِسی نفسیات کی دین ہے۔ یہی متعصب نفسیات افتراق بین المسلمین کے ختم یا کم نہ ہونے بلکہ مسلسل بڑھنے کا بڑا سبب ہے۔

ٹکراؤ کی نہیں، تفہیم و اصلاح کی ضرورت

ہمارے خیال سے کھائیوں کو ہمیشہ پاٹنے کا جذبہ رکھنا چاہیے۔ افہام و تفہیم اور مذاکرہ و مباحثہ کا دروازہ کبھی بند نہ کیا جائے۔ رد کے بجائے تفہیم اور نفرت کے بجائے خیر خواہانہ دکھ سامنے آنا چاہیے، ٹکراؤ سے حتی المقدور بچا جائے، کوشش کی جائے کہ کسی طرح تفہیمِ مسئلہ کر کے محوِ فتنہ ہو۔ ٹکراؤ سے مدمقابل جنم لیتا ہے جو کمزور ہو یا طاقت ور، مدمقابل کے نام سے اُس کا نفسِ وجود ہی دنیا میں حق

کی جلوہ فرمائی کی شان کے خلاف ہے۔ حق سے بھٹکے ہوئے سے کسی لمحے مایوس نہ ہوا جائے۔ یقیناوہ حق پر نہیں مگر حق سے بہت دور نہیں، پس حاملِ حق بنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر آدمی اپنی مومنانہ شناخت کے سوا ساری شناختیں مٹا کر اور تحفظات سے اوپر اُٹھ کر تفہیمِ حق کا فریضہ انجام دے تو اِکا دُکا ہی ہوگا جو کسی قدر اعتدال پر نہ آئے گا۔ عام سطح پر مباحثے میں یہ پیشِ نظر رکھنا چاہیے کہ گفتگو اگرچہ شخصِ خاص سے ہو رہی ہے مگر دنیا سن رہی ہے اور شخصِ خاص کی صورت میں بالواسطہ بہت سے ایسے لوگوں سے تخاطب چل رہا ہے جو حق کے جذبے سے صاحبِ حق کے طرف دار ہو سکتے ہیں۔ لہذا نہایت اصولی، غیر جذباتی اور خیر خواہانہ انداز میں بات جاری رکھنا چاہیے۔

ہندوستان میں فرقۂ وہابیہ

ہندوستان میں اہلِ سنت کے خلاف سب سے طاقت ور فرقۂ وہابیہ اسماعیلیت پھر دیوبندیت کی شکل میں رونما ہوا۔ جس کے بعد ہدایت وضلالت کے درمیان ردوقدح کی جنگ چھڑ گئی۔ بظاہر ایسا لگتا ہے کہ تحریکِ جدید مسلمانوں کے فکروعمل میں اصلاحات چاہتی تھی مگر نہ جانے توحید پسندی کے جذبے سے یا شعوری منصوبہ بندی کے نتیجے میں اِس نے بعض وہ فکری ٹھوکریں کھائیں جو کسی حال میں برداشت کے قابل نہ تھیں۔ ثمرہ یہ کہ خود گھروں سے مخالفت شروع ہوگئی، دیکھتے ہی دیکھتے متحدہ ہندوستان اِس کی لپیٹ میں آ گیا۔ اِس ضلالت کے رد میں خاندانِ شاہ ولی اللٰہی، علماے فرنگی محلی، علماے خیر آبادی، علماے بدایونی وغیرہ نے بہت بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اِن خانوادوں کی کاوشیں رہیں کہ وہابیت سخت روسیاہ ہوئی، نتیجتاً کبھی نام بدلا، کبھی کام۔ جب کہ بعد میں تحریکِ ردوہابیہ کے بطلِ جلیل اعلی حضرت، امامِ اہلِ سنت مولانا احمد رضا خاں بریلوی علیہ الرحمہ قرار پائے۔

اعلی حضرت کی کاوشِ ردِوہابیہ کی خوبی یہ ہے کہ یہ نہایت منظم، بھرپور اور ایسی ٹکاؤ ہے کہ آج بھی تحریکِ بریلی کی شکل میں آب وتاب کے ساتھ قائم ہے۔ اعلی حضرت ردِوہابیہ کے لیے وقف تھے، وقت کا تقاضا بھی یہی تھا۔ لگتا یہ ہے کہ اللہ نے آپ کو خاص دفعِ فتنۂ وہابیہ کے لیے چن لیا تھا۔ یقینا سابقہ اَکابرینِ اہلِ سنت نے متحدہ ہندوستان میں زبردست ردِوہابیہ کیا مگر آخر میں اعلی حضرت نے ایک ایسی بھرپور ضرب کاری لگائی جو وجودِ ضلالت میں ہمیشہ کے لیے ایک ناسور بن گیا۔ اعلی حضرت نے اِس مہم میں عرب وعجم کو شامل کیا جو بڑی بات ہے۔

اعلیٰ حضرت کا ذوقِ فکر اور ردِ باطل کی پالیسی

اعلی حضرت کا ذوقِ فکر کیا تھا اور ردِ باطل کی آپ کی پالیسی کیا تھی۔ یہ چیز لائقِ تنقید و تجزیہ بنائی جاسکتی ہے۔ مگر کسی منصف سے منفی تجزیے کی اُمید نہیں کی جاسکتی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ دفاعِ مسلکِ حق کے لیے تنہا ذاتِ مسعود نے کیسی زندہ مہم چھیڑی، کیسی ٹھوس بنیادوں پر اپنی بات رکھی۔ ہمارے پاس اِس کا کیا جواب ہے کہ اعلی حضرت نے اِسی ذوقِ خاص کی بنیاد پر مہم میں اتنی کامیابی حاصل کی۔ دنیا میں خیال وعمل دو چیزیں ہوتی ہیں، آدمی ایک خیال پیش کرتا ہے مگر وہ کہاں تک درست ہے یہ عملی میدان میں تطبیق ہی فیصلہ کرسکتی ہے۔ ہمیں وسیع پیمانے پر اعلی حضرت کی ذات کامیاب ہی کامیاب نظر آتی ہے۔

اعلی حضرت کی تحریک سے ایک عہد متاثر ہوا۔ دینی تصلب اور احتیاط پسندی کو فروغ ہوا۔ شانِ اُلوہیت اور عظمتِ رسالت وولایت کے مزید ولولے ہوئے۔ آپ کے تلامذہ یا تربیت یافتگان اور خلفا نے آپ کی تحریک کو کمزور پڑنے نہیں دیا اور دفعِ فتنہ میں زندگیاں کھپا دیں۔ حق کے دیوانوں کی ایک انجمن قائم ہوگئی۔ کام کو وسعت دی گئی، ادارے، تنظیمیں، تحریکیں وجود میں آئیں، کتابیں الماریوں سے اُتریں، کاغذ وقلم حرکت میں آئے، دفاعِ عظمتِ رسالت وولایت کے ساتھ عقائد ومعمولاتِ اہلِ سنت کو تحفظ فراہم ہوا، دفاعِ موقفِ اعلی حضرت پر مناظرے ہوئے وغیرہ۔

اعلیٰ حضرت نے مسلکی چیلنج قبول کیا

اعلی حضرت کا عہد عام ہندوستانیوں اور بالخصوص مسلمانوں کے لیے عبوری حالات رکھتا تھا۔ قومی سیاست، عصری تعلیم اور مسلکی اشتباکات تین بڑے ظاہرے تھے جن میں مسلمانوں کا امتحان ہو رہا تھا۔ اعلی حضرت نے اللہ کے لیے مسلکی چیلنج کو قبول کیا اور اِس میں اِس قدر کامیاب ہوئے جیسے ذرا پہلے سرسید نے عصری تعلیم کے چیلنج کو قبول کر کے اُس میں کامیابی حاصل کی۔ تحفظِ مسلکِ اہلِ سنت کے سلسلے میں اعلی حضرت کی کامیابی دوٹوک ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ حیدرِ زمانہ کی حملہ آوری کے بعد گمراہان اُس ٹریک سے تقریباً اُتر سے گئے جس پر وہ اپنی تحریروں سے چلنے کا عزم ظاہر کرتے تھے۔

لیکن دیگر میدانوں میں نمائندگی ایک مسئلہ بنی۔ یہ میدان سیاسی اور عصری تعلیم ہی کے

نہیں، ہر طرح کے تھے۔ اعلی حضرت کے مدمقابل دو طرح کے لوگ تھے، کچھ قطعی اور براہِ راست مسلکی مخالفین اور کچھ وہ لوگ جو آپ کی علمی احتیاطوں یا ترجیحات پر کاربند نہ ہو سکتے تھے۔ اِن دونوں طبقوں نے مختلف میدانوں میں اشتراک یا اشتراک جیسے ماحول میں کاوشیں کیں۔ گستاخانِ رسول اور بے احتیاطوں یا عام سے لوگوں کی خاصا تعداد تھی، دوسری طرف سخت صاحبِ موقف تنہا ذاتِ اعلی حضرت اور ایک طاقت ور فتنے سے نبرد آزمائی۔ نتیجتاً بیش تر میدانوں میں خاطر خواہ نمائندگی نہ ہو سکی۔ یہ چیز بڑے فرق کے ساتھ بایں طور دوسروں کے کھاتے میں چلی گئی کہ اُنھوں نے دیگر لوگوں سے تقرب کر کے خدمتوں کو حلقۂ بریلی کے مقابلے کسی قدر اپنا سا رنگ دے دیا۔

بعد والوں کے لیے چیلنج

بعد کے علماے اہلِ سنت کے سامنے اِس کمی کا اِزالہ ایک چیلنج تھا۔ دوسرا چیلنج مٹھی بھر گمراہ طبقے کو چھوڑ ملک بھر کے مسلمانوں اور بالخصوص دینی و علمی اداروں اور خانقاہوں کو اعتماد میں لینا تھا۔ پہلی کوشش سے یہ ہوتا، کہ جو قدرے دنیادار یا نیم مذہبی کاموں میں دل چسپی لینے والا یا خالص آزاد خیال یا غیر جانب دار مسلم طبقہ تھا اُس کی نظر میں عظمت بیٹھتی۔ جب کہ دوسری کوشش سے ''ردِ وہابیہ'' نہیں بلکہ ''محوِ وہابیہ'' کی تحریک چلتی اور اُس میں مزید پچاس فی صد طاقت ہاتھ آ جاتی، ردِ وہابیہ کی تحریک گروہی نہ ہو کر عوامی ہو جاتی۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ ہمیں اِس کی دو وجوہات معلوم ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ اعلی حضرت کے بعد غیر شعوری طور پر یا ضرورتِ تحفظِ مسلکِ حق کی خاطر خاص رخ پر ذہن بندھ سا گیا۔ یا یہ عمل کچھ نہ کچھ نرمی چاہتا تھا جس کے لیے فطری ذوق اور اجتہادی نقطۂ نظر سے اعلی حضرت روادار نہ تھے مگر بعد میں تکلف سے کام لیا گیا۔ یا بعض چیزیں ایمرجنسی اقدام کے تحت تھیں جنھیں بعد میں ریگولر اور جنرل اصول بنا لیا گیا۔

چیلنج آج بھی قائم

البتہ ردِ وہابیہ کا سلسلہ قائم رہا اور آج تک کہ اعلی حضرت کے وصال کو صدی ہونے جا رہی ہے، تابانی کے ساتھ قائم ہے۔ مگر نقصان یہ ہوا کہ ایک ذرا احتیاط نہ چھوڑنے کی کوشش میں فتنہ بڑھ گیا۔ شومیِ قسمت کہ جو کمی عہدِ اعلی حضرت میں رہ گئی تھی اور بعد والوں کے لیے چیلنج تھی وہ آج بھی ایک بڑے چیلنج کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ اِس کمی سے بڑا خسارہ ہوا ہے۔ گمرہی عام ہوئی اور

ہم پھیل کر بھی سمٹ گئے۔ کیوں کہ ہم بریلوی نہیں، مسلمان تھے اور ہیں، اعلی حضرت کسی طبقے کے نمائندہ نہ تھے، بلکہ مسلمانوں کے رہبر و رہنما تھے۔ مگر ہندوستانی مسلمانوں کی بڑی تعداد فکری گمرہی سے متاثر ہو گئی جب کہ ہم حلقہ جاتی تحفظات میں رہ کر حلقہ بن گئے۔ اِسی کمی کا نتیجہ ہے کہ آج ایک عام آدمی یا تو دیوبندیت کو اُتنا بُرا نہیں جانتا یا ہمیں بھی اُس کے ساتھ ایک فرقہ خیال کرتا ہے۔ اِس کمی کے نتیجے میں عام مسلمانوں کی حق تلفی ہوئی۔ ہم اُن کی مزید اصلاح کر سکتے تھے، اُنھیں مزید تحفظ دے سکتے تھے مگر ہم نے اُنھیں نہیں جوڑا، بسا اوقات دھتکارا، جس کا لچک دار رویہ رکھنے والے اغیار نے بھرپور فائدہ اُٹھایا۔

ردِ وہابیہ نہیں، محوِ وہابیہ

ہماری نظر میں حلقۂ بریلی کے حضرات نے چیلنجز سے نبرد آزمائی میں جو کوتاہی کی اُس کے کئی بڑے اسباب میں ایک قوی سبب یہ ہے کہ اُنھوں نے اپنی کوششوں کا مقصد محوِ وہابیہ کے بجائے ردِ وہابیہ بنا لیا۔ رد کا مطلب ہے قبول نہ کرنا جسے انگریزی میں reject کرنا کہہ لیجیے، جب کہ مقصود اِتنا نہیں بلکہ فتنے کو محو کرنا اور مٹانا ہے جسے انگریزی میں erase کرنا یا delete کرنا کہا جا سکتا ہے۔ رد سے مراد اِحقاقِ حق و اِبطالِ باطل لیا جائے، تب بھی فی نفسہٖ حق کو حق اور باطل کو باطل ثابت کر کے مطمئن ہو جانا مقصد نہیں۔ بلکہ یہ محوِ باطل کے مختلف ذرائع میں سے صرف ایک ذریعہ ہے جس کی مدد سے اصل ہدف جو محوِ باطل ہے، کی تحصیل میں مدد حاصل کرنا ہے۔

دونوں میں فرق بھی واضح ہے۔ رد کا مطلب کام اَدھورا ہے، محو کا مطلب کام ختم ہوا۔ رد کے بعد فتنے کی طرف سے عدمِ اطمینان برقرار، جب کہ محو کے بعد کامل اطمینان۔ رد کو اِس سے دل چسپی نہیں کہ رد کے بعد کتنے لوگوں نے ترکِ باطل کیا جب کہ محو کی اصل دل چسپی ہی یہی ہے۔ رد یعنی عدمِ قبول یا احقاقِ حق و ابطالِ باطل فی نفسہٖ کسی حکمت و مصلحت کا بھی مقتضی نہیں، یہ اِس سے زیادہ نہیں کہ پہلی صورت میں انسان کے اپنے ذاتی حق کی ادائیگی ہے اور دوسری صورت میں بہت حد تک علم و قابلیت کا مظاہرۂ محض۔ جب کہ باطل کے محو و ازالہ کے لیے مذکورہ خوبیوں کے ساتھ حکمت و تدبیر بھی ناگزیر ہے کیوں کہ یہاں باضابطہ دوسروں کو باطل سے آزادی دلانا مقصود ہے جس کے لیے حکمت و دانائی ضروری ہے۔ اِس نکتے کی وضاحت کے بعد عرض ہے کہ ردِ باطل کو مقصد بنانا ناقص مقصد بنانا

ہے۔ اِسی نقصِ تعیینِ ہدف نے حلقے کی مجموعی نفسیات پر خاص اثر ڈالا ہے۔

ردکو مقصد بنانے کا نقصان

مگر چوں کہ ہم نے عموماً رد ہی کو فائنل مقصد بنا لیا جس کا نقصان یہ ہے کہ ہم حکمت سے کام نہیں لے پاتے، بہت حد تک اِس کی ضرورت بھی نہیں پڑتی جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، نہ دیگر ذرائع کا استعمال کر پاتے ہیں کیوں کہ وہ محوِ باطل کے ذرائع ہیں، ردِ باطل کے نہیں۔ نتیجتاً باطل مٹنے کے بجائے پھل پھول رہا ہے جس کی ہمیں بہت زیادہ پروا نہیں۔ ہم لوگوں کے درمیان ردِ باطل کر کے فراغتِ ذمہ داری کا احساس کر لیتے ہیں۔

کہیں محوِ باطل کے لیے حسنِ اخلاق یا نرمی کی ضرورت ہوتی ہے شدت کی نہیں، کہیں اثباتِ حق کی ضرورت ہوتی ہے نفیِ باطل کی نہیں، یا کہیں عام شعبہ ہائے زندگی میں نسبتاً زیادہ خدمات پیش کر کے لوگوں کو خود سے قریب و مانوس کرنے کی ضرورت ہوتی ہے صرف مسلکی حدوں تک سرگرمیاں محدود رکھنے کی نہیں، کہیں دیگر طرق ہائے حکیمانہ اختیار کرنے کی۔ مگر ہم یہ سب نہیں کرتے، کیوں کہ نفسِ رد یعنی رفضِ باطل یا احقاقِ حق و ابطالِ باطل کی حد تک اِن کی ضرورت نہیں پڑتی۔ مقصد اِن کے بغیر حاصل ہو جاتا ہے۔

مزید سمجھیے۔ کسی جلسے میں ردِ وہابیہ پر مبرہن تقریر کر کے واضح احقاقِ حق و ابطالِ باطل کر دیا تو بلاشبہ صرف اتنے عمل سے نفسِ رد متحقق ہو گیا۔ مگر محو کا تحقق ابھی لازم نہیں۔ محو اپنے تحقق کے لیے محوِ باطل تک باطل کا تعاقب کرے گا۔ وہ رد کے بعد باطل پر جمے ہٹ دھرموں کا دوسرا علاج تلاش کرے گا۔ محو ابھی چین سے نہیں بیٹھے گا جب کہ ردِ محو خرام ہو رہے گا۔ محو اِس بات کا بھی مجاز ہوگا کہ لوگوں کا مزاج اور حالات کی نزاکت دیکھ کر سرے سے روائتی رد ہی نہ کرے، بلکہ دیگر ذرائع کا استعمال کر کے حصولِ مقصد کرے۔ مثلاً بعض اہلِ باطل کو صرف مسلسل حسنِ خلق سے غیر شعوری طور پر باطل سے دور اور حق سے قریب کر دے۔ ہم صوفیۂ کرام کی دینی کاوشوں پر غور کریں۔ اُنھوں نے تقریباً ہر طرح کے کاموں کے لیے بکثرت ذرائع میں سے زیادہ اعتماد خدمتِ خلق اور محبتِ خلق پر کیا۔

ردکو مقصد بنانے والوں نے کئی غلطیاں کیں۔ اولاً یہی کہ ذریعۂ مقصد کو مقصد سمجھا، ثانیاً محدود ترین ہدف متعین کیا، ثالثاً فروغِ سنیت میں حکمت و دانائی سے کام نہیں لیا، رابعاً اصل ہدف یعنی محوِ باطل کو

مقصد سمجھنے والوں اور اُس کے لیے مختلف ذرائع سے سعی کرنے والوں کی نیک نیتی پر شک کیا وغیرہ۔ ہم سچ کہیں تو تازہ اختلافات کی اصل وجوہات میں سے ایک بڑی وجہ یہ ناروا شک بھی ہے۔ جو لوگ اپنے ہی بعض احباب پر ردِ وہابیہ نہ کرنے کا الزام دیتے ہیں، یہاں انصاف یہ ہے کہ معترضین عموماً روائتی ردِ صریح پر زیادہ زور دیتے ہیں اور حکمت و بصیرت سے کام نہیں لیتے جب کہ دوسرے لوگوں کی نظر محوِ وہابیہ پر زیادہ ٹکی ہوتی ہے اور حکمت و دانائی سے کام لیتے ہیں۔ مثلاً دعوتِ اسلامی روائتی معنی میں رد وہابیہ نہیں کرتی مگر محوِ وہابیہ بے حد کرتی ہے کہ لوگوں کو عقائدِ اہلِ سنت کا حامل بناتی ہے، سُنتوں کا پابند کرتی ہے، وہابیت سے دور رکھتی ہے۔ نتائج بھی بہت مختلف آتے ہیں کہ معترضین سے عموماً اپنا حلقہ بھی کنٹرول نہیں ہو پاتا جب کہ دعوتِ اسلامی غیروں میں گھس کر سنی گری کرتی ہے۔ دعوتِ اسلامی محوِ وہابیہ کے لیے مقتضائے حال کے مطابق زیادہ کارگر ذرائع اختیار کر کے محوِ باطل کرتی ہے، اِسی لیے زیادہ کامیاب بھی ہے۔

طبقۂ بریلوی میں شدت واعتدال کی جنگ

حلقے کے تازہ حالات مزید عبرت ناک ہیں کہ اب آپس ہی میں سخت سر پھٹول جاری ہے۔ یہ جنگ حکمت و اعتدال اور جذباتیت و شدت کی ہے جسے لڑنے کے لیے صلح کلیت اور تصلب کا نام دے دیا گیا ہے۔ اِس انتشار کا ایک سبب تو یہی ہے کہ محوِ باطل کے بجائے غلطی سے نفسِ رد کو مقصد بنا لیا۔ دوسرا اصل سبب وہ تکلف ہے جسے اعلی حضرت کے بعد مسلسل آج تک برقرار رکھا گیا ہے اور جو آج اپنے عروج پر پہنچنے کے بعد پھل دے رہا ہے۔ مزید یہ جھگڑا ذمے داری سے فرار ہے جسے چھُپانے کے لیے دھاندلی بحال کر لی گئی ہے۔ سوال یہ ہے کہ حل کیا ہے۔ ہمارے پاس دوٹوک جواب یہ ہے کہ ہم بریلوی سے پھر مسلمان بنیں اور خود کو اسلام کی خدمت کے لیے تیار کریں یا شعارِ بریلویت اور شعارِ سنیت میں امتیاز تسلیم کریں اور بریلویت کے بجائے صرف سنیت کا فروغ کریں، صدی بھر بعد حالات بہت بدل گئے ہیں، تازہ حالات میں گمراہ اور راہ رو کی از سرِ نو شناخت کریں، نیز بدلے حالات میں دین و ملت کی ضرورتوں کو سمجھیں۔

اعلی حضرت علیہ الرحمہ ہمارے آئڈیل ضرور ہیں اور اُن کی تحقیقات سر آنکھوں پر مگر ہمارا دین صرف اسلام ہے اور ہمارا مُقتدا اے فیصلہ کُن رسول اکرم علیہ الصلوۃ والسلام کی ذات۔ ہم اسلام کی کشادگیوں سے فائدہ اُٹھائیں اور نئے حالات میں رہبرِ عالم کی جامع شخصیت سے روشنی حاصل

کریں۔ اعلیٰ حضرت یقیناً چودھویں صدی میں اُبھرنے والی عظیم شخصیت ہیں۔ مگر اولاً آپ کو گزرے صدی بِیت چکی ہے، جس کا مطلب ہے کہ حالات اِتنے بدل گئے ہیں کہ عنداللہ بھی تسلیم کرلیے گئے ہیں اور نئے حالات میں نئے مجدد کی آمد متوقع ہے۔ ثانیاً ضرورت خِیرگی کی نہیں بصیرت کی ہے، جنون کی نہیں ہوش کی ہے۔

احتساب ناگزیر

ذمے داریوں کو سمجھنے کا بہتر طریقہ احتساب ہے۔ ہمیں چاہیے کہ سر جوڑ کر بیٹھیں اور صدی بھر کا منصفانہ جائزہ لیں۔ دیکھیں کہ ہم نے کیا کھویا اور اغیار نے کیا پایا۔ ہم اپنی ساری پالیسیوں کا منصفانہ جائزہ لیں اور حصولیابیوں پر نظر ڈالیں۔ ہمیں امید ہے کہ نیک نیتی سے کی گئی کوشش رائیگاں نہیں جائے گی۔ لوگ کہہ رہے ہیں صرف کام کرو مگر صدی بھر بعد احتساب اُس سے زیادہ ضروری ہو گیا ہے۔ مسلسل غلط روی سے مَنازل کا بُعد بڑھ رہا ہے جس کے لیے روشِ کارواں میں تبدیلی اور اِس تبدیلی کی ضرورت کے احساس کے لیے سخت احتساب لازم ہے۔ جماعت میں ایک بڑا طبقہ جذباتی ہے، یہ ہماری طاقت ہے۔ ہمیں اِس کا استحصال نہیں بلکہ رہ نمائی کرکے اِس کی مالی ونفری طاقت کو دفعِ باطل میں صرف کرنا ہے، یہی ہمارا کام ہے۔ یہ کہہ دینا روا نہیں کہ آپ ہی کچھ کرکے دکھایئے، دوسرے کو نہ چھیڑیے۔ اِس لیے کہ چند لوگوں کی کوششوں سے لاکھوں لوگ بیدار ہوجائیں اور کام پر لگ جائیں، یہ اِس سے بہتر ہے کہ چند لوگ کسی کو نہ جگائیں اور کام کی اتنی بڑی دنیا میں خود ہی مغز ماری کرتے رہیں، جب کہ اُن کے پاس نہ نفری طاقت ہے، نہ مالی وسعت، نہ پوری طرح علمی قوت۔ تاہم اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ وہ ہم سب کو زیادہ سے زیادہ خدمتِ دین کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ واللہ الموفق وھوالمستعان۔

(2)

دعوتِ دین کے جدید تقاضے

دینِ اسلام کو نازل ہوئے چودہ سو سالوں سے متجاوز عرصہ گزر چکا ہے۔ اِس عرصے میں نہ جانے کیسے کیسے حالات آئے مگر اسلام اِن تمام نشیب وفراز سے گزرتا ہوا آج پندرہویں صدی میں داخل ہوچکا ہے۔ اِس کی بھی کئی دہائیاں گزر چکی ہیں۔ لیکن اللہ کا نازل کردہ اور رسول اللہ کا تبلیغ کردہ یہ دین یہاں تک یوں ہی منتقل نہیں ہوا۔ بلکہ امتِ مسلمہ کے لائق اور توفیق یافتہ فرزندوں نے اپنے اَدوار میں اس کے فروغ وارتقا کی کاوشیں کیں اور نسلِ آئندہ تک منتقل کرنے کی سعیاں جاری رکھیں۔ نتیجتاً آج تک نسلِ انسانی اسلام کی نعمتوں سے بہرہ ور ہے۔

بلاتمہید یہ ذمے داری اب ہمارے سروں پر عائد ہے کہ ہم اسلام کے فروغ کی زیادہ سے زیادہ کوشش کریں، اُبھرتی نسلِ نو کے دلوں میں اُسے راسخ کریں، اسلام سے محروم لوگوں کو دعوتِ اسلام دیں، خود کے اندر جو خرابیاں اور کمزوریاں ہیں اُنہیں دور کریں۔ ہر زمانے کی طرح زمانۂ حاضر میں بہت سے گم راہ افکار ونظریات موجود ہیں جن کا رد وابطال بھی مقتضائے دین ہے۔ لیکن جس طرح ہر کام کے اصول ہوتے ہیں، دینی دعوت وتبلیغ کے بھی اصول ہیں۔

قرآن مجید نے اِس سلسلے میں جو رہ نمائی فرمائی ہے وہ نہایت جامع اور مثالی ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ دینی دعوت کے لیے حکمت ودانائی اور اچھی نصیحت وموعظت اختیار کی جائے، اگر کسی سے بحث ومناظرہ کرنا پڑے تو اس کے لیے احسن طریقہ اپنایا جائے۔ اہلِ نظر کے لیے یہاں خاص نکتہ ہے۔ اللہ نے تین کلمات ارشاد فرمائے: حکمت، موعظتِ حسنہ، مجادلۂ حسنہ۔ یہ تینوں کلمات اپنے مفہوم میں نہایت جامع اور مقصود میں نہایت قطعی ہونے کے باوجود حالات کے اعتبار سے بدلتے ممکنہ مصداقاتی انطباقات کے لیے لچک رکھتے ہیں۔ یہ کلمات ایسے ہیں جو اپنے مصداقات بدل سکتے ہیں، مقصودات نہیں۔ دعاۃ ومبلغین کے لیے اِن کے اندر غور وخوض کے بعد صحیح فیصلہ لینے کی وسیع گنجائشیں رکھی گئی ہیں۔ وقت کی مناسبت سے دعاۃ ومبلغین کو یہ تینوں کلمات اِس بات کا حق دیتے ہیں کہ وہ حالاتِ دائرہ کی رعایت سے اپنی صوابِ دید کے مطابق صحیح فیصلہ لیں۔

کسی زمانے میں ردِ باطل کے لیے فلسفہ اور منطق کی تعلیم ضروری تصور کی جاتی تھی،

حضرت امام اشعری اور حضرت امام غزالی وغیرہ نے اپنے اپنے زمانے میں ردِ باطل کے لیے علومِ عقلیہ سے آراستہ ہو کر حکمتِ وقت پر عمل کیا، مگر آج دیگر علوم زیادہ ضروری ہیں، آج اُن کی تحصیل تقاضاے وقت اور حکمتِ زمانہ ہے۔ البتہ مقصود ایک ہے تقویتِ دین و ترویجِ اسلام۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایسا ہو سکتا ہے بلکہ ہوتا ہے کہ آج جو عمل حکمت ہے، کل اُس کا ترک حکمت ہو۔ مگر صحیح وقت پر یہ چیز اُن ہی لوگوں پر واضح ہوتی ہے جن کو اللہ کی توفیق ملتی ہے، جن پر مقصود واضح و بیّن ہو اور جو حصولِ مقصد میں مخلص ہوں۔ البتہ کچھ دائمی قدریں ضرور ایسی ہیں جو انسانی فطرتِ سلیمہ کا حصہ ہیں، جو کبھی نہیں بدلتیں۔ ایسی قدروں کو دائمی طور پر اختیار کیے رہنا حکمت ہے۔ حکمت ہی کی طرح حسنِ موعظت اور حسنِ مجادلہ ہے، جن کی اپنی اپنی تفصیل ہے۔ کل ملا کر اِن کاوشوں کا خلوصِ نیت اور بے لوث خیر خواہی کے جذبے سے ہم آہنگ ہونا ضروری ہے۔

دینی دعوت و تبلیغ کے لیے قرآنی نصوص کی یہ مثلث ہدایت: حکمت، موعظت اور مجادلہ کی تفصیل کی جائے تو سیکڑوں ہزاروں جزئیات و تعریفات ہو سکتی ہیں۔ البتہ ہم اِن مثلث کے ترشحات کے طور پر چند چیزیں عرض کریں گے جن کا ہماری نظر میں آج کے حالات میں اختیار کیا جانا ضروری ہے۔ اِن میں بعض وہ باتیں بھی ہو سکتی ہیں جن پر مزید توجہ کی ضرورت ہے اور بعض وہ بھی جن کو ہم نے کلیتاً ترک سا کر دیا ہے حالاں کہ اُن کو نظر انداز کرنا خلافِ حکمتِ زمانہ اور دین کا بڑا نقصان ہے۔ ہم دونوں طرح کی باتیں فی الوقت جماعتِ اہل سنت کے حلقۂ بریلی کو نظر میں رکھ کر عرض کریں گے۔ ملاحظہ فرمائیں:

دینی و اسلامی سوچ رکھیں

اِس سلسلے میں سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ بہ حیثیتِ داعی و مبلغ خالص دینی و اسلامی سوچ رکھی جائے جس کا مطلب یہ ہے کہ سوچ کو دینی و اسلامی حدوں تک وسیع رکھا جائے۔ گروہ پسندی و جتھہ پرستی سے ذہن صاف رہے۔ مسلکِ اہلِ سنت کی ترویج و اشاعت خالص دینی و اسلامی سوچ کے ساتھ کی جائے۔ مسلکی ترجیحات کی بایں صورت ترویج ہو کہ اسلام اِس کا تقاضا کرتا ہے، اُس کا نہیں یا دین اِس کا تقاضا کرتا ہے، اُس کا نہیں۔ مسلک یقیناً اسلام کے بغیر نہیں مگر مسلک جن خاص عقائد و مسائل سے ممتاز ہوتا ہے یا جن خاص عقائد و مسائل کو کہا جاتا ہے وہ امور و مسائل، اسلام کا پانچ دس فی صد حصہ ہے۔ لہٰذا عام حالات میں اِس حصے کے لیے اِتنی ہی توانائی صرف ہونا چاہیے۔

ساتھ ہی ذہن میں قطعاً مشربی امتیازات نہ ہوں۔ قادریت و چشتیت کا فروغ نہ کیا جائے، نہ حنفیت و شافعیت کی علم برداری کی جائے، صرف دینِ اسلام کے لیے کام کیا جائے، صرف دینِ اسلام کے نام سے کیا جائے۔ فقہی مذہب و طریقتی مشرب وغیرہ محض ذاتی ذوق تک محدود رہیں۔ آج وسیع النظر اہلِ علم دعاۃ و مبلغین کی سخت کمی ہے۔ ایسے میں جو ہیں وہ خاص مسلکی اختلافات یا مشربی امتیازات کے فروغ میں لگ جائیں، جو اہلِ قلم ہیں وہ محدود موضوعات پر قلم فرسائی کرتے رہیں، مقررین اُنہیں عنوانات پر زورِ زباں صرف کرتے رہیں اور تنظیمی و تحریکی ذہن رکھنے والے اُسی خاص دائرے میں اپنی سرگرمیوں کو محدود رکھنے لگیں، تو دین کے دیگر گوشوں کے لیے کون کام کرے گا۔ ایسا کرنے سے لوگوں کا ایک بہت بڑا طبقہ جن کے ابھی مبادیاتِ اسلام ہی کلیئر نہیں، ہماری کوششوں سے محروم رہ جائے گا۔

ساتھ ہی سماج میں ایک بڑا طبقہ ایسا ہے جسے مسلکی اختلافات سے کچھ دل چسپی نہیں، وہ سیدھے سادے انداز میں دینی و اسلامی باتوں پر عمل کرنا چاہتا ہے، جہاں موٹے طور پر خیر دیکھتا ہے، اُس میں شریک ہو جاتا ہے، جہاں خالص مسلکی جنگیں دیکھتا ہے، کنارہ کش ہو جاتا ہے۔ اِس مزاج کے لوگوں کو چاہتے ہوئے بھی اپنے ذوق کے مطابق نہیں ڈھالا جا سکتا۔ یہ اِس طبقے کا فطری مزاج ہے، مزید یہ طبقہ علما کے مسلکی اختلافات در اختلافات اور جنگیں در جنگیں دیکھ کر بھی اختلافات سے بدظن اور بیزار ہے جو کسی قدر روا ہے۔ اِن لوگوں کا ایک خاص دائرے کے گرد گھوم رہی مسلکی سرگرمیوں سے دینی حق مارا جاتا ہے۔ یقیناً فروغِ مسلکِ حق کے لیے کاوشیں کی جائیں مگر عملی میدان میں اِس کی تطبیق یہ ہے کہ ضرورتاً مسلکی ترجیحات کے تحفظ و مدافعت پر محنت کی جائے، جب کہ عام عادت کے طور پر عام خدمتِ دین کی جائے۔ مسلکی ترجیحات، مشترکہ اسلامیات، سماج سے ردِ منکرات، مسلمانوں میں فروغِ تہذیب و ثقافاتِ اسلامی، غیر مسلموں کو دعوتِ دین، یہ سب کرنے کے ضروری کام ہیں مگر اِن پر اُسی وقت کام کیا جا سکتا ہے جب سوچ خالص دینی اور اسلامی ہو۔ دل چسپی کہیں ہو تو بے دلی اور عدمِ دل چسپی سے یہ کام نہیں ہو سکتے۔

دینی و اسلامی سوچ کا نتیجہ ہوگا کہ اخلاقیات، معاشیات، سماجیات، سیاست و حکومت، زبان و ادب، تاریخ و ثقافات وغیرہ موضوعات پر اسلامی نقطۂ نظر سے توجہ مبذول ہو سکے گی۔ نیز وسیع تناظر میں ردِ عیسائیت، یہودیت، بہائیت، قادیانیت، استشراقیت، دہریت، زندیقیت جیسے

عنوانات پر کام میں حوصلہ ملے گا۔ خالص مسلکی سوچ والا یہ سب نہیں کرسکتا۔ یوں بھی معلوم کہ خاص عام کے اندر ہوتا ہے، نہ کہ اس کا برعکس، تو صرف مسلکی ترجیحات پر کام سے اسلام کی عام ترجیحات پر کیسے کام ہوسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جماعت کا کل اثاثہ اُٹھا کر دیکھ لیا جائے، یقیناً حیا آئے گی۔ موضوعات نہایت محدود۔ فکر و قلم میں وہ تاثیر بھی نہیں جو جدید متمدن ذہن و فکر کو اپیل کرتی ہو۔ دراصل ہماری ثقافات بہت محدود ہیں۔

حالیہ دنوں ہماری محدود سوچوں نے ہمیں مزید تنگ نظر بنا دیا، آج ہم ایسے خوں خوار بن گئے ہیں کہ ہم نے اپنا ہی وجود سلامت نہیں رکھا۔ سچ یہ ہے کہ اِس کے لیے دو چار ہی ذمے دار نہیں۔ بیش تر ایسے ہیں جن کو اپنے ماضی کا احتساب کرنا چاہیے۔ دراصل جب چیز اپنے عروج پر پہنچ جاتی ہے، یا واضح لفظوں میں حدود سے تجاوز کر جاتی ہے تو زوال کی طرف بڑھنے لگتی ہے۔ آج بھی اعتدال کے لیے جاری جنگ میں داخلی طور پر عبرت ناک انتشار کے باوجود ہمارے اندر اتنا اعتدال پیدا نہیں ہوا ہے کہ داخلِ اہلِ سنت اختلافات کو بآسانی دین و سنیت کے فروغ کی خاطر یا سیدھے یوں کہیے کہ تقاضائے حق و انصاف کی خاطر مثبت طور پر قبول کرلیا جائے۔ ہر کوئی اپنے تحفظات لیے بیٹھا ہے جہاں دوسرے کو حقِ اختلاف نہیں۔ آج تک جماعتِ اہلِ سنت کا مفہوم ہی اتنا محدود رہا ہے جس کے حصار سے بہ یک دفع نکلنا دشوار ہے۔

خاص سوچ بنالینے کا ثمرہ ہے کہ حلقۂ بریلی کے لگ بھگ ہر سطح کے تمام جونیئر سینئر علما کے موضوعاتِ عمل بے حد محدود ہیں (الا ماشاء اللہ)۔ ہمارا بڑے سے بڑا عالم محض مسلکی سرگرمیوں کے حصار میں قید ہے، مزید تخصیص کر کے بھی کہا جاسکتا ہے کہ اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خاں علیہ الرحمہ کی شخصیت کے ارد گرد گھوم رہا ہے۔ کچھ عام ورک کیا جاتا ہے تو وہ بھی اِس طرح خاص رنگ میں کہ اپنی عمومیت کھو دیتا ہے۔ حلقۂ بریلی کی تنگیِ فکر و ذہن کا اندازہ اِس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اِس حلقے کے دو بڑے فقہی تحقیقات کے ادارے مجلس شرعی مبارک پور اور شرعی کونسل بریلی جن کا مقصد کسی قدر اجتماعی شکل میں تحقیقات کر کے جدید مسائل کا شرعی حل نکالنا ہے، مگر بجائے اِس شرط پر اکتفا کے کہ حل مسلکِ اہل سنت یا خاص فقہِ حنفی کے مطابق نکالیں گے، یہ شرط لگا رکھی ہے کہ کسی بھی حال میں تحقیقاتِ اعلیٰ حضرت سے نہیں ہٹیں گے۔ حالاں کہ یہ بھی ذکر کرسکتے تھے کہ اولاً کوشش یہی کریں گے کہ حل تحقیقاتِ رضوی کے مطابق نکلے، البتہ اختلاف بھی کرسکتے ہیں۔ عجیب و غریب شرط ہے۔ پر کتر رکھے

ہیں پروازِ فکر و تحقیق کے۔ نتیجتاً اسلام ہی نہیں، مسلکِ اہلِ سنت بلکہ خاص فقہِ حنفی کی وسعتوں تک سے خود کو محروم کر رکھا ہے۔ یہ بھی کسی قدر روا تھا مگر اِس کے ساتھ غریب سنیوں کے ذہنوں میں یہ بٹھا رکھا ہے کہ صحیح معنی میں سنی وہی ہے جو اِس ''راستے'' پر چلے۔

آج ضرورت ہے کہ ہم دہائیوں سے چلے آرہے اپنے یک رخی فکر و عمل کا ہمہ جہت احتساب کریں، ساتھ ہی حالیہ مذاقِ جماعت اور سرگرمیوں اور پھر حصولیابیوں پر محتسبانہ نظر ڈالیں۔ مسلک کے نام پر غیر ضروری حذر اور اتباعِ بزرگاں کے نام پر بے بصیرتیِ زمانہ سے دین کا مسلسل نقصان ہو رہا ہے جسے محسوس کرنے کی ضرورت ہے۔

کتنی عبرت ناک بات ہے کہ حلقۂ معتقدینِ بریلی میں ہمیں کوئی مفکرِ اسلام نظر نہیں آتا حتی کہ مفکرِ اہلِ سنت کو دیکھنے کے لیے آنکھیں ترس رہی ہیں۔ جو حضرات کچھ ہیں، اُن میں مطلوبہ مستحکم عزم و حوصلہ اور مضبوط کردار و عمل مفقود ہے۔ آج بھی اُن میں اتنی سکت پیدا نہیں ہوسکی ہے کہ کھل کر اصولی گفتگو کرسکیں۔ یہ قحط الرجالیت اعلیٰ حضرت کے بعد تخلیق کی گئی بے ذوق فضا کے نتیجے میں سامنے آئی ہے۔ آہ ہمیں مبلغِ اسلام علامہ عبدالعلیم میرٹھی کی گزرگاہِ قدم دکھائی نہ دی! آہ ہم پر دردمندِ سنیت علامہ ارشد القادری کی گردابِ قدم نہ پڑی!

ہمیں یہ بات نہیں بھولنا چاہیے کہ ہندستان وہابی مزاج نہیں رکھتا۔ اِس کا اندازہ اِس سے لگایا جاسکتا ہے کہ یہاں وہابیائی تحریک نے اپنے عقائدی ایشوز کو قوم کے سامنے پیش کر کے ترقی نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ عموماً لوگ اُس کے فاسد و باطل خیالات سے باخبر نہیں، اِس سلسلے میں اہلِ سنت کی طرف سے خاصا تشہیر کی گئی مگر جب وہابیائی تحریک کے کارکنان نے اپنی طرف سے پبلک میں اُن کو متعارف ہی نہیں کرایا تو ہماری یک طرفہ کاوشِ تشہیر دیکھ کر لوگ کنفیوز سے ہوئے، اُنہیں لگا پتا نہیں کیا پنگا ہے حالاں کہ بات سچ ہے۔

وہابیائی تحریک کی عوامی ترقی نماز و روزے کی دعوت اور بعض فروعی اختلافات یا بعض قابلِ اصلاح بدعات کے خلاف پروپیگنڈے کی مدد سے ہوئی ہے۔ اُنہوں نے وہابیت کا فروغ مسلک کے نام سے نہیں، اسلام اور دین کے نام سے کیا۔ لہٰذا فروغِ سنیت کے لیے ہمیں بھی وسیع عنوان کے تحت کام کرنا ہوگا۔ عقائد یا تازہ حالات میں زیادہ صحیح یہ ہے کہ شدید متنازع عباراتِ فرقۂ ضالہ کی تشہیر کو ایک حد دینا ہوگی۔ مطلب یہ نہیں کہ باطل سے سمجھوتہ کرلیا جائے (نعوذ باللہ) بلکہ ذوقِ

زمانہ کے پیشِ نظر حکمتِ بالغہ اختیار کرنا ہوگی۔ ہمیں اپنے کردار و عمل سے ظاہر کرنا ہوگا کہ مسلکِ حق ہی کے نہیں اسلام اور دین کے بھی نمائندے ہم ہیں۔

خوبیوں کا اعتراف کریں

خوبی اور خامی جس جگہ جس مقدار میں پائی جائیں، ہمیں اُن کا منصفانہ اعتراف کرنا چاہیے۔ یہ چیز ہمارے یقین کا حصہ ہونا چاہیے کہ اِس دنیا میں کوئی چیز کلیتاً بُری نہیں۔ ہر چیز کی تخلیق میں حکمتیں ہیں اور ہر انسان کے اندر کچھ نہ کچھ کمالات اور خوبیاں ہیں۔ کافروں اور بدمذہبوں کے اندر بھی کچھ ایسی خوبیاں ہوسکتی ہیں جس کے حقیقتاً ہم مستحق ہیں۔ حدیثِ حکمتِ ضالہ اِس پر روشنی ڈالتی ہے۔ رسول اللہ نے عمر ابن خطاب کو اللہ سے طلب کیا تو یقینا آپ عمر کی بعض خوبیوں سے متاثر ہوئے، وہ آپ کو پسند آئیں حالاں کہ عمر اُس وقت حالتِ کفر میں تھے۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر سہیل نامی کافر بحیثیتِ وکیل از جانبِ کافرینِ مکہ آیا تو رسول اللہ نے فرمایا کہ اب معاملہ سہل ہوگیا۔ ہجرت الی المدینہ کے موقع پر آپ نے ایک کافر کو دلیل الطریق کے طور پر اختیار کیا، یہ اُس کی خوبی کا اعتراف تھا۔ نیز مشہور جاہلی شاعر امرء القیس کو اَشعر شعراء العرب قرار دیا جو خوبی کا اعتراف تھا۔

مطلب یہ ہے کہ کسی کی کلیتاً نفی نہ کی جائے۔ یہ جہاں فی نفسہٖ ناانصافی کی بات ہے وہیں اس کا تبلیغی نقطۂ نظر سے نقصان دہ پہلو یہ ہے کہ حریف کی خامیوں کے ساتھ خوبیوں کو بھی رد کر دینے سے خامیوں کے ساتھ خوبیاں مل کر ہماری حریف بن جاتی ہیں اور شخصِ مخالف مزید طاقت میں آجاتا ہے۔ اُس وقت ہمیں اُس کی خامیوں اور خوبیوں دونوں کو رد کرنا پڑتا ہے جس کے لیے دوہری طاقت صرف کرنا پڑتی ہے۔ خوبیوں کا اعتراف کرلیا جائے تو صرف خامیاں حریف رہیں گی اور اکیلے کمزور ثابت ہوں گی۔ مقصد بھی یہی ہے کہ لوگوں کی صرف خامیوں اور کمزوریوں کو دور کیا جائے۔

بعض لوگ جذبات میں آکر مدِ مقابل کی کل چیزوں کو رد کر دیتے ہیں، اِس طرح خود کو مصیبت میں پھنسا لیتے ہیں۔ ہماری ضد دیکھ کر مدِ مقابل عموماً خالص ہٹ دھرمی پر اُتر آتا ہے۔ اُسے اور جتنے لوگ گفتگو سن رہے ہوتے ہیں، سب کو آپ کے نامناسب رویے سے یہ تاثر ملتا ہے کہ آپ ہر بات اپنی ہی منوانا چاہتے ہیں، آپ انصاف پسند نہیں۔ یہاں اصل نقصان اُس حق کا ہوتا ہے جسے آپ سامنے والے کو قبول کرانا چاہتے ہیں۔ آپ کا غیر حکیمانہ طرزِ عمل دیکھ کر وہ آپ کی حق بات بھی سرے سے رد کرنے لگتا ہے۔ خود اپنی کمزوریاں بھی سامنے آئیں تو بے چوں چرا تسلیم کرلینا چاہیے۔

یہ خلوصِ نیت کا تقاضا ہے، مزید اِس شرافتِ عمل سے مدعو کے دل میں داعی کے لیے احترام کا جذبہ جنم لے گا اور ایک داعی کی اصل کامیابی یہی ہے کہ اُس کے فکر و عمل کے تئیں لوگوں کے دلوں میں احترام تخلیق پا جائے۔

نبی کریم علیہ الصلوۃ والسلام کے چچا ابوطالب بھی تھے جو تحقیق کے مطابق آخر تک ایمان نہیں لائے اور ابولہب اور ابوجہل بھی، مگر سلوک کی نوعیت الگ الگ تھی، اسی طرح بعض کفار سے اظہارِ ہمدردی کیا، اِعراض و درگزر سے کام لیا مگر بعض دیگر کے ساتھ قطعاً کسی طرح کی نرمی اور ہمدردی نہیں برتی، حالاں کہ کفر کفر سب ایک سا، اِس سب سے ہمیں داعیانہ انداز سیکھنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں یہ بات نہیں بھولنا چاہیے کہ عموماً لوگ فطرتاً بُرے نہیں ہوتے، ایسے بہر حال بہت کم ہوتے ہیں، اپنے ہوں یا غیر۔ لوگوں میں بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہوتی ہے کہ اگر اُن پر حق واضح ہو جائے تو دیر سویر اُسے قبول کرلیں گے یا کم از کم اُس کے خلاف متعصّبانہ سازشیں رچنا ضرور چھوڑ دیں گے۔

کچھ علما سامنے والے کی ایک نہیں سنتے، سامنے والا معقول بات بھی کہتا ہے، پھر بھی منطقی داؤ پیچ میں الجھا کر اُسے ظاہراً ساکتِ لسان مگر باطناً خوگرِ عدوان بنا دیتے ہیں۔ یہ مسئلے کا حل نہیں۔ دعوت و تبلیغ کا مقصود یہ نہیں کہ ایک عامی سے جارحانہ مناظرہ کر کے جلدی سے فتح کا جھنڈا بلند کر دیا جائے، یہ فتح دراصل شکست ہے، یا صرف مناظر کی فتح ہے، دین کی فتح اُس وقت تک نہیں جب تک سامنے والا حق قبول نہ کر لے، مقصدِ تبلیغِ دین بھی لوگوں کو حق قبول کرانا بلکہ اُن کے دلوں میں حق بٹھانا اور راسخ کرنا ہے نہ کہ مناظرے جیتتے پھرنا۔ سامنے والا مخلصانہ انداز میں بعض زائرینِ مزاراتِ اولیا کے افراط و تفریط کا ذکر کرے تو حکمت و انصاف کے جذبے سے قابلِ اصلاح چیزوں کو کھلے دل سے قابلِ اصلاح تسلیم کیا جائے۔ یہ شکست نہیں، نہ یہ حق کا کمزور پڑنا ہے۔ اعتراف کے رویے میں دعوتی حکمت یہ ہے کہ جب سامنے والے کو یہ احساس ہوگا کہ میرے شکوے شکایات کو بھی توجہ سے سنا جا رہا ہے تو کسی قدر داعی و مبلغ کی باتوں پر کان دھرے گا۔

غور کیجیے، جس کے فکر و اعتقاد کی بڑی اصلاح مقصود ہو، اُس کی ایک نہ سنی جائے یا سنی اَن سنی کر دی جائے اور غیر تکریمانہ انداز میں اُس پر مسلسل حاوی اور سوار رہنے کی چترائی دکھائی جائے تو سامنے والا کیوں کر کسی صحیح بات کا ہم نوا بن سکتا ہے۔ یوں سمجھیے کہ جب داعی مدعو کی ایک نہیں سنے گا تو مدعو بھی داعی کی ایک نہیں سُنے گا۔ مزید یہ بات خلافِ فطرتِ انسانی ہے کہ ایک ہی مجلس میں کوئی

شخص ساری باتیں دوسرے کی تسلیم کرتا جائے۔ غرض اسلام ہر جگہ انصاف چاہتا ہے، ہٹ دھرمی اور اندھا دھندی نہیں۔ فرض کرو، سامنے والا جس گروپ سے متاثر ہے اُس کے بعض رفاہی یا سیاسی کاموں کا ذکر کرے تو اگر وہ واقعی قابلِ تحسین امور ہیں تو اُنہیں رد نہ کیا جائے بلکہ کھلے دل سے اعترافِ حقیقت کیا جائے۔ یہی اسلام کی تعلیم بھی ہے۔

حسنِ ظن سے کام لیں

حسنِ ظن کا مطلب ہے عام حالات میں کسی کے حق میں ترجیحاً بہتر خیال رکھنا، یہ تقاضاے انسانیت بھی ہے، تقاضاے شریعت بھی۔ کسی کی شخصیت میں اچھے اور بُرے دونوں طرح کے پہلو موجود ہوں یا کسی کی حرکات وسکنات مشتبہ ہوں، تو چاہیے کہ اچھائی کے پہلو کو ترجیح دے، بدگمانی سے بچے۔ حسنِ ظن کی اہمیت وعظمت قرآن وحدیث میں بکثرت مصرح ہے۔ مزید اِس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ شریعت کے بہت سے مسائل صرف حسنِ ظن پر انحصار کرتے ہیں۔ تکفیر کے مسئلے میں علما فرماتے ہیں کہ کسی بات میں نناوے پہلو کفر کے ہوں اور ایک اسلام کا تو تکفیر سے بچا جائے اور حسنِ ظن کے سہارے متعلقہ شخص کے اسلام کا تحفظ کیا جائے۔

لیکن اِس کا مطلب یہ نہیں کہ ایسے شخص پر اہم اور نازک ذمے داریوں میں بھی بھروسا کیا جائے۔ یہاں حزم واحتیاط ضروری ہے۔ حدیثِ رسول ہے کہ مومن ایک سوراخ سے دو مرتبہ نہیں ڈسا جاتا، حدیث مشتبہ چیزوں میں حزم واحتیاط کا تقاضا کرتی ہے۔ مگر یہ مطلب نہیں کہ کسی سے ایک مرتبہ دھوکہ ملا تو اُس سے ہمیشہ ہر معاملے میں بدگمان رہا جائے، ورنہ حدیثِ حسنِ ظن کا کوئی مطلب نہ ہوگا۔ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ آئندہ کے لیے احتیاط اور فراست سے کام لیا جائے اور اس کا مطلب اپنے حقوق کا تحفظ ہے بس، کسی سے متعلق سوءِ ظن رکھنا اِس کا مقصود نہیں۔

عصرِ حاضر کے تناظر میں یوں سمجھیے۔ علماے دیوبند سے جن بنیادی عباراتِ مذمومہ کو لے کر اختلاف ہے، یہاں سچی بات یہ ہے کہ اُن سے متعلق اکثر دیوبندی عوام بے خبر ہیں، بہت سے فضلا تک اختلاف کی صحیح نوعیت سے لاعلم دیکھے گئے ہیں، عموماً وہ اِس غلط فہمی میں ہوتے ہیں کہ نذر و فاتحہ اور عرس ومزار ہی اصل وجہِ اختلاف ہیں۔ ایسے میں بلاتحقیق اُن سب کے متعلق یہ اجتماعی خیال کرنا کہ اُن کا ہر ہر فرد توہینِ انبیا کا مرتکب اور ختمِ نبوت کا منکر ہے، خالص سوءِ ظن ہے۔ ایسے لوگوں کو بلاامتیاز خبیث ومردود کہتے پھرنا درست نہیں، نہ ایسے لوگوں کے ساتھ وہ سلوک روا ہوگا جو ایک مرتکبِ

توہینِ انبیا کے ساتھ ضروری ہے۔ یہاں معاملے کی شخصی طور پر تحقیق ضروری ہے۔ یہاں حسنِ ظن یہ ہے کہ اُن میں سے بیش تر لوگ غلط فہمی کا شکار ہیں جو ایک طرح سے حقیقت ہے۔ سماجی ظاہرہ یہ ہے کہ بعض عوامِ اہلِ سنت کچھ مستحسنات میں افراط وتفریط کرنے لگتے ہیں جسے دکھا دکھا کر بعض فطرتی لوگ یہ الزام دیتے ہیں کہ یہی ہے بریلی والوں کا اصل مسلک اور یہی اصل بنیاد ہے دیوبند و بریلی کے اختلاف کی۔ یہ اُن کا الزامِ محض ہے جسے قیامت کے دن اللہ کی عدالت میں اُنہیں کو ثابت کرنا ہوگا۔

ہاں اِس الزام تراشی کے نتیجے میں جو بہت بڑی تعداد میں عوام گم راہ ہوتے ہیں، وہ بہر حال ہماری طرف سے کسی سخت کلامی اور ترش رویے کے نہیں بلکہ دعوتی ہم دردی اور خیر خواہانہ اصلاح کے مستحق ہیں۔ یہ لوگ غلط فہمی کے نتیجے میں حمایتِ حق کے جذبے کے زیرِ اثر بعض اوقات بے تکی باتیں بول جاتے ہیں، مگر بہر حال وہ ہم سے رد ومناظرے کے نہیں، تفہیم واصلاح کے مستحق ہیں۔ اِن لوگوں کے ساتھ پہلے ہی مرحلے میں نفرت وشدت کا مظاہرہ کرنا اور کچھ سنے سمجھے بغیر اُنہیں خبیث ومردود کہنے کی رٹ لگانا، نہ صرف مقصدِ دعوت وتبلیغ کے لیے مضر ہے بلکہ حدود سے تجاوز ہے۔ اِس طرزِ تبلیغ بلکہ یوں کہیے کہ نامناسب حرکت سے عام لوگ حق سے مزید دور ہوجاتے ہیں۔ وہ مستحق کسی سلوک کے ہوتے ہیں اور پیش کسی سلوک سے آیا جاتا ہے۔ یہ رویہ ایک عام شخص کو حق کے خلاف ضدی بناتا ہے۔

اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا علیہ الرحمہ کا فتویٰ ہے کہ جو مخصوص علماے دیوبند کو کافر نہ جانے وہ بھی کافر ہے۔ دورِ حاضر میں علماے بریلی اِس کی تاویل یہ کرتے ہیں کہ چوں کہ موجودہ وقت میں بہت سے مسلم عوام اصل عقائدِ علماے دیوبند کا علم رکھے بغیر اُن سے مثبت طریقے پر متاثر ہیں، اِس لیے اُن پر فتوئ من شک نافذ نہیں ہوگا۔ ہم اِسی تاویل سے استفادہ کرتے ہوئے عرض کریں گے کہ چوں کہ اِن لوگوں کو نہ اصل عقائدِ علماے دیوبند کا علم ہے، نہ یہ خود اِس طرح کے عقائد رکھتے ہیں، اِس لیے یہ ہم سے کسی بے تکے، بھونڈے، نفرت وشدت بھرے رویے کے مستحق نہیں، نہ پہلی ہی ملاقات میں شدید رد وقدح اور جارحانہ مناظرے کے روادار ہیں بلکہ صرف اصلاح وتفہیم کے مستحق ہیں۔ اُن کے تعلق سے صرف حسنِ ظن ہی رکھا جاسکتا ہے۔

یہ عوامی طبقہ بسا اوقات بعض مستحسنات کے خلاف اڑیل رویہ اپنا سکتا ہے، مگر جب اُسے اصل وجہِ اختلاف کا علم ہی نہیں، اُسے جتنا علم ہے وہ یہ کہ بریلوی لوگ مزاروں پر جا کر سجدے کرتے ہیں، یہ اُمید رکھ کر نماز وروزہ چھوڑ دیتے ہیں کہ قیامت کے دن پیر ولی بخشوالیں گے، غیر اللہ کا نام لے

کر مرغے بکرے ذبح کرتے ہیں، تیجے چالیسویں ایصالِ ثواب کے لیے نہیں، اپنے پیٹ بھرنے کے لیے کرتے ہیں وغیرہ۔ اِس غلط فہمی کا شکار بہت سے فضلا تک دیکھے گئے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ آج جب باطل یا فاسد نظریات سے لاکھوں لاکھ لوگ متاثر ہیں، یہ دو طرح کے ہیں عقائدی اور سماجی یا حقیقی اور عرفی۔ ہمارے لیے اصل چیلنج یہ ہے کہ گروہی عصبیت کے زیرِ اثر نہیں بلکہ خالص خداترسی اور للّٰہیت کے جذبے سے اُن کی صحیح تفتیش کریں۔ ذہن میں یہ رکھیں کہ دھاندھلی کسی مسئلے کا حل نہیں۔ بعدِ تفتیش اُن میں جو، از روے شرع جس سلوک کا مستحق ہے، اُس کے ساتھ برتیں۔

بالخصوص عرفی و سماجی متاثرین کی اصلاح کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ ایک طرف ہم بعض عوامِ اہلِ سنت کے درمیان رائج منکرات کا ازالہ کریں، دوسری طرف اُن کی دردمندانہ افہام و تفہیم کریں۔ اُنہیں بتائیں کہ بعض چیزیں واقعی عوام غلط کرتے ہیں جن کی اصلاح میں آپ ہماری معاونت کریں، مگر علماے دیوبند کے کچھ نظریات نہایت مذموم ہیں جن سے بچیں۔ یہاں پہلے ہی دن عوام سے مخصوص علماے دیوبند کو کافر کہلوانے پر اصرار نہ کیا جائے کہ یہ دعوتی حکمت کے خلاف ہے۔

حسنِ ظن اِس لیے بھی ضروری ہے کہ حدیثِ پاک ہے کہ عمل کا دار و مدار نیت پر ہے، جب کہ نیت دل کے ارادے کا نام ہے، جسے اللہ جانے یا صاحبِ نیت۔ حدیث کا مطلب ہوا کہ اللہ کے نزدیک کسی بندے کے عمل کے پسندیدہ و ناپسندیدہ ہونے کا معیار اُس کی نیک یا بدنیت ہے۔ بندے کے لیے یہ مرحلہ سخت کٹھن ہے، اُسے دوسرے کی نیت کی کیا خبر، حالاں کہ عمل کے اچھے برے ہونے کا فیصلہ نیت ہی کے اچھے بُرے ہونے پر موقوف ہے۔ لہٰذا راہِ نجات یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ حسنِ ظن رکھا جائے۔ ہمارا ذاتی احساس ہے کہ اکثر اختلافات سوءِ ظن کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ جب کہ حسنِ ظن مسائل کے نمٹارے کا دوسرا نام ہے۔

تشدد نہیں، تصلب

دینی دعوت و تبلیغ کے لیے کسی بھی صورت میں تشدد کی گنجائش نہیں۔ بلکہ الٹے ایک داعی و مبلغ کے اندر تشدد کو برداشت کرنے کا قوی حوصلہ ہونا چاہیے اور جذبات دکھانے کے بجاے حکمت سے کام لینا چاہیے۔ بے ضرورت پھٹ پڑنے سے کارِ دین انجام نہیں دیا جا سکتا۔ اِس سلسلے میں خود رسول اللہ اور آپ کے بعد صحابہ اور دیگر صالحینِ امت کے داعیانہ کردار و عمل سے روشنی حاصل کی جا سکتی ہے۔ رسول اللہ جذبات دکھانے پر اُترتے تو پہلے ہی دن جب ابولہب نے بدکلامی کی تھی، سارا

معاملۂ دعوتِ اسلام درہم برہم ہو جاتا، یا طائف کے دعوتی سفر میں سب کچھ اُلٹ پلٹ جاتا مگر رسول اللہ نے جذباتیت و شدت سے نہیں، حکمت و تحمل سے کام لیا۔ ہم ہندوستان میں فروغِ اسلام کا سہرا زیادہ تر صوفیہ کے سر باندھتے ہیں جو سراپا خلوص، پیار، خدمتِ خلق، تکریمِ انسان کی علامت ہوتے تھے اور جن کے دربار ہر خاص و عام کے لیے فیضِ عام کا منبع ہوتے تھے۔

یوں بھی تشدد اور تصلب کے درمیان مثبت اور منفی ہونے کے اعتبار سے بُونِ بعید ہے۔ تشدد اعصابی کمزوری اور کردار کے ضعف کا نام ہے جو انسان کے اندر ایک نَقص ہے۔ جب کہ تصلب ایک قابلِ تحسین خوبی ہے جس کے بغیر انسان ادھورا ہے۔ تشدد کا مطلب آدمی اپنے آپ میں بے قابو ہے، اُسے اِس سے غرض نہیں کہ اب کیا نتیجہ آئے گا۔ جب کہ تصلب اپنے اوپر سراپا اعتماد و یقین کا نام ہے اور اِس بات کا حکیمانہ جنون کا کہ مقصد کو بہر حال حاصل کر کے رہنا ہے۔ تشدد کا مطلب ترکش کا آخری تیر جب کہ تصلب کا مطلب انسان ابھی سنجیدہ اقدامی طاقت سے لبریز ہے۔ تشدد اِدبار و شکست کا مُشعِر ہے جب کہ تصلب عزم و اقدام کا مشعر۔ آخری یہ کہ تشدد کسی مسئلے کا حل نہیں جب کہ تصلب کے بغیر کسی مسئلے کا حل نہیں۔ غرض تشدد اپنی جملہ انواع کے ساتھ مردود اور تصلب اپنی جملہ انواع کے ساتھ محمود ہے۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ تشدد سے کام بگڑتے ہیں۔ دعوت و تبلیغ کے لیے یہ زہرِ ہلاہل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ کی داعیانہ زندگی میں کہیں تشدد نہیں۔ داعیانہ زندگی گزارنے والے صالحین او رصوفیۂ کاملین کی زندگی میں تشدد کہیں نہیں۔ مگر تصلب ایسا کہ کوہِ ہمالیہ بھی جس سے درسِ صلابت حاصل کرے۔ ہم عدمِ تشدد کی مثال میں تبلیغی جماعت کو دیکھیں، اِنہیں ہزار دھتکارا جائے، بُرا بھلا کہا جائے، مگر یہ لوگ کبھی نہیں گرماتے۔ یقینا یہ بھٹکی ہوئی جماعت ہے مگر ہم یہ تو غور کر سکتے ہیں کہ اِس کی اِسی لچک دار پالیسی کے باعث آج وہابیت گاؤں گاؤں متعارف ہے۔ ہم خالص سنی تنظیم 'دعوتِ اسلامی' کے طرزِ دعوت و تبلیغ پر غور کریں، اِس کے لوگ کس قدر مخلص اور عدمِ تشدد کی چلتی پھرتی مثالیں ہوتے ہیں، اِسی لیے یہ تنظیم اور اس کے افراد اپنے دعوتی مشن میں کامیاب ہیں۔

داعی کو غور کرنا چاہیے کہ جب کسی کو اُس کے دین دھرم کے خلاف دعوت دی جائے گی تو لازماً وہ بھڑکے گا۔ بعض مبلغین خیال کرتے ہیں کہ ہم حق بات بتا رہے ہیں پھر کیوں نہیں سمجھتا۔ لیکن سچ یہ ہے کہ اُس وقت تک حق مدعو پر واضح نہیں ہوا ہوتا ہے۔ داعی و مبلغ کی طرف سے دعوت و تبلیغ کے

وقت بسا اوقات تیز طرار دلائل کے پیچ وخم میں پھنس کر مدعو خیال کرتا ہے کہ میں بھی اپنے بڑوں کی طرح پڑھا لکھا ہوتا تو اِنہیں جواب دیتا۔ داعی کے لیے اصل چیلنج یہی ہے کہ غیر ضروری شاطرانہ داؤ پیچ سے نہیں بلکہ مخلصانہ تفصیل و وضاحت سے اُس پر حق واضح کرے۔ اُس کو ذلیل نہ کرے تاکہ وہ بھی احترام سے آپ کی بات سنے اور اُس پر خلوصِ نیت سے دھیان دے، غور کرے۔ بعض علما ذرا کسی کو مشکوک دیکھتے ہیں، سخت دھتکار لگاتے ہیں، ایسے علما سمجھتے ہیں کہ اعلیٰ حضرت نے اپنے ماننے والوں کو اِسی رویے کی وصیت کی تھی۔ یہ خالص غلط فہمی ہے۔

مزید ہم اعلیٰ حضرت کی شدت کو پیشِ نظر رکھتے ہیں، مگر یہ نہیں سوچتے کہ صوفیہ نے تو تقریباً بالکل شدت نہیں برتی، اگر اعلیٰ حضرت نے خدمتِ دین وسنیت کی تو صوفیہ نے مزید بڑھ کر خدمتِ دین وسنیت کی، پھر کیا وجہ ہے کہ صوفیہ کے طریقۂ تبلیغِ دین کو قطعاً نظر انداز رکھا جائے۔ صوفیہ نے شدتوں کو جذب کیا، خلقِ خدا کو سینے سے لگایا، حتی کہ اُن کے دلوں کو موم کر دیا اور وہ پگھل کر دامنِ اسلام میں پناہ گزیں ہو گئے۔ پھر اعلیٰ حضرت میں جلالِ فاروقی کا عکس تھا جس کا مطلب ہے کہ وہ مخلصانہ تھا، فطری تھا، خالص جذبۂ ایمان کا ثمرہ تھا، حقیقی عشقِ رسول کا نتیجہ تھا جب کہ ہم یہ رویہ کئی جہتوں سے تقلیداً و تکلفاً اپناتے ہیں۔

ہمیں یہ کہنے میں باک نہیں کہ شدت سے آج تک صرف نقصان ہی ہوا ہے۔ اعلیٰ حضرت نے یقیناً تحفظِ سنیت کیا، ردِ ضلالت کر کے شاہ راہِ اہلِ سنت کو واضح کیا، شدتِ رضا سے تابِ مقابلہ نہ پا کر اہلِ ضلالت ابتداءً جس ڈگر پر چلنا چاہتے تھے، اُس سے اُتر سے گئے مگر بعد میں بے حکمت و بلا ضرورت سخت مزاجی کے ذریعے شاہ راہِ اہلِ سنت صرف ذوقِ خاص کی ڈگر بنتی چلی گئی۔ دراصل حالات میں تبدیلی آئی جو تبدیلیِ حکمت کا تقاضا کرتی تھی جسے ہم نے بروقت لبیک نہ کہا۔ بعد میں ہم ناکام اور اغیار کامیاب ہوتے چلے گئے۔ ہمارے پاس اِس کی دلیل یہ ہے کہ غیروں نے امتِ مسلمۂ ہندِ متحدہ کا حصہ توڑ کر اپنا بڑا جتھہ تشکیل دیا جب کہ ہم نے صرف اتنا کیا کہ اُسی امتِ مسلمۂ ہند متحدہ سے ایک معتد بہ حصہ حاصل کر کے حلقۂ بریلی تشکیل دے دیا۔ ہمارا اہم کارنامہ صرف یہ ہے کہ ایک محدود طبقہ تشکیل دے کر اُس میں سنیت کو مستحکم کیا، حالاں کہ اپنوں ہی میں سے جتھہ بنا لینا کمال نہیں، کمال یہ تھا کہ اغیار، مسلمانانِ ہند سے قابلِ لحاظ حصہ حاصل نہ کر پاتے۔ حلقۂ بریلی اس روک تھام میں ناکام رہا ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ حضراتِ بریلی نے سنیت کا مستحکم حلقہ ہی تشکیل نہیں دیا بلکہ گم راہ تحریکِ دیوبند کے خلاف باضابطہ شدید مزاحم طاقت تشکیل دی اور فوج عام شہریوں سے کم ہی ہوتی ہے۔ مگر یہ کہنا اُس وقت درست ہوتا جب عام شہریوں کو اعتماد میں لیا جاتا اور یہ احساس دلایا جاتا کہ ہم اُن کے دین ومسلک کا دفاع کر رہے ہیں۔ یہاں حال یہ ہے کہ ہم اُن کو بھی مشکوک العقیدہ سمجھتے ہیں، کیوں کہ وہ خاص ذوق کے ساتھ عقیدت مندانِ بریلی جو نہیں۔ چہ جائے کہ ہم اُن کے عقیدہ ومسلک کی پاسبانی کریں۔ ثانیاً وہ خود ہماری سختیوں سے پریشان ہیں، یہاں تک کہ اغیار کے مقابلے کسی قدر ہم ہی کو جھگڑالو تصور کر کے نسبتاً اغیار سے تقرب اختیار کرتے ہیں۔ نتیجتاً ہماری یہ سخت مزاجی توسیعِ حلقۂ دیوبند میں معاون ثابت ہو رہی ہے۔ اور اب تو اِس بھونڈی شدت سے داخلِ حلقہ سنجیدہ افراد ہی نالاں ہیں، حالیہ خانہ جنگی اِس پر دلیل ہے۔ غرض موجودہ شدت ہر پہلو سے غلط ہے۔ ہم سختی کا مطلق انکار نہیں کرتے مگر حلقے کی بنیادی خطا یہ ہے کہ اس کی عام پالیسی ہی تشدد و جذباتیت پر مبنی ہے۔ نرمی وتحمل اور حکمت وسنجیدگی جزوی وخاص حالات کے مستثنیات بن کر رہ گئے ہیں، یعنی ترتیب اُلٹ گئی ہے۔

فی صد پر کام کریں

فی صد پر کام کرنے کا مطلب ہے یہ دیکھنا کہ ہماری کوشش کے نتیجے میں سامنے والا ایک فی صد بھی خیر کی طرف متوجہ ہوا یا نہیں۔ اگر کسی قدر خیر سے قریب ہوا تو ہمیں اُس سے مطمئن ہونا چاہیے اور اُس حد تک اُسے قبول کرنا چاہیے۔ ہماری بات اُس نے قبول نہیں کی مگر اُس کے اندر ہمارے تئیں کسی قدر اُنس تخلیق پا رہا ہے، تو یہ مثبت ردِ عمل ہے۔ داعی ومبلغ کو چاہیے کہ وہ پہلی ہی ملاقات میں کسی پر نہ چڑھ دوڑے، نہ فوراً کسی بڑے مثبت ردِ عمل کی امید رکھے۔ ظاہر ہے کوئی شخص پہلی ہی ملاقات میں اپنا دین دھرم یا موقف ومسلک ترک کرنے پر بہ آسانی کیسے آمادہ ہو سکتا ہے۔ فی صد پر کام کرنے کی سوچ رکھنے کا فائدہ یہ بھی ہوگا کہ اپنی مساعی سے داعی ومبلغ کبھی مایوس نہیں ہوگا۔

کچھ لوگ اپنی داعیانہ کوششوں کا فوری اور سو فی صد نتیجہ چاہنے لگتے ہیں اور اِس جذبے کے زیرِ اثر سامنے والے پر کچھ اِس طرح سے حاوی ہونے لگتے ہیں بلکہ بسا اوقات ایسے نامناسب داؤ پیچ کھیلنے اور غیر ضروری ہتھکنڈے اپنانے لگتے ہیں کہ سامنے والا بات جاری رکھنے میں اُکتاہٹ کا احساس کرنے لگتا ہے اور کسی حیلے سے وہاں سے ہٹ جانا چاہتا ہے۔ یہاں تک نوبت نہیں پہنچنا چاہیے۔ اِس سے سامنے والے پر جو اثر اب تک ہوا ہوتا ہے، وہ بھی زائل ہو جاتا ہے۔ دراصل بے صبری اور غیر ضروری

عجلت کسی مسئلے کا حل نہیں۔ غور کیجیے، کیا ہمارے رسول نے بت پرستانہ ماحول میں چالیس سال خالص صبر کے ساتھ نہیں گزارے اور کیا اعلانِ نبوت کے بعد تقریباً تیئس سال تک یہ علم رکھنے کے باوجود کہ خانۂ خدا ہی میں مشرکینِ مکہ تین سو ساٹھ بتوں کی پوجا کر رہے ہیں، ازحد صبر و تحمل سے کام نہیں لیا۔

کچھ لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ اگر کسی مسجد کے لوگ سنی بریلوی امام رکھنے پر راضی ہو جاتے ہیں تو بجائے یہ کہ کچھ دن یا کچھ ماہ اتنے پر قناعت کریں، پہلے ہی دن سے بیٹھ کر تکبیر، بعدِ اذان صلوۃ و تثویب، بعدِ فجر صلوۃ وسلام اور پہلے ہی جمعہ کو اذانِ خطبہ خارجِ مسجد وغیرہ ساری چیزیں نافذ کر دینا شروع کر دیتے ہیں۔ وہ یہ خیال کر کے مطمئن ہو جانا چاہتے ہیں کہ کوئی اعتراض کرے گا تو دیں گے خبیث کو منھ توڑ جواب، ہمارے پاس سارے سوالات کے جوابات ہیں۔ مگر یہ نہیں سوچتے کہ لوگ عموماً یہ احساس کر کے کہ نئے امام آتے ہی فتنے پھیلانے لگے، مسجد کا امن وسکون غارت کر رہے ہیں، اُن سے کون پنگا لے گا، حساب کر کے دوسرے ہی دن سیدھے بوریا بستر باندھ لینے کا آرڈر کر دیتے ہیں۔ اِسی طرح کچھ ائمہ لاؤڈ اسپیکر پر نماز نہ پڑھانے کی قسم کھا بیٹھتے ہیں، پوری پوری مسجدیں دیگر فرقوں کے لیے چھوڑ دیں گے، مگر لاؤڈ اسپیکر پر نماز نہیں پڑھائیں گے۔

ہم سے ظاہراً ایک سمجھ دار لگ رہے مولانا امام نے اپنا ایک کارنامہ بتاتے ہوئے کہا کہ (ایک معتبر شہر میں) میری مسجد کے اہلِ محلہ میں سے ایک صاحب کا انتقال ہو گیا، چوں کہ جنازہ صاحبِ حیثیت کا تھا اور جوانی میں انتقال ہوا تھا، اِس لیے بڑی تعداد میں لوگ شریکِ جنازہ تھے جس میں خاصی تعداد مختلف فکر و مزاج کے لوگوں کی تھی، نماز مجھے پڑھانا تھی، اجازت ملتے ہی میں مصلے پر کھڑا ہو گیا، اس کے بعد جیسے ہی صفیں تیار ہوئیں، میں نے بہ آوازِ بلند اعلان کر دیا کہ کوئی دیوبندی، وہابی، مودودی، تبلیغی، نیچری وغیرہ میرے پیچھے نماز نہ پڑھے اور صف سے الگ نکل جائے۔ بقول مولانا، اعلان سنتے ہی ساری صفوں میں ہل چل مچ گئی، فوراً طرح طرح کی باتیں ہونے لگیں اور غصے میں بہت سے لوگ صفوں سے نکل کر باہر کھڑے ہو گئے، مگر میں نے کوئی توجہ نہ دی اور نماز پڑھانے کے لیے نیت باندھ لی۔

اِسی طرح ہمارے ایک متعلق کا ایک مسجد میں مستقل امام کی حیثیت سے تقرر ہوا، چند ایام نماز پڑھائی کہ ایک جمعہ میں قبلِ خطبہ تقریر کرتے ہوئے سیدھے ہی اذانِ خطبہ خارجِ مسجد ہونا چاہیے، پر دلیرانہ دادِ تحقیق دینے لگے، بعدہ اذانِ خطبہ کا وقت آیا تو لوگوں میں اختلافات ہو گئے اور شور شرابا ہونے لگا، جیسے تیسے لوگ خاموش ہوئے، نماز بھی بارہ پندرہ منٹ دیر سے ہوئی۔ نتیجتاً بعدِ نماز

امام کو چلتا کر دیا گیا۔ ایک دوسرے متعلق نے دوسری مسجد میں بہ حیثیت امام پہنچنے کے بعد جہاں تقریباً ساری چیزیں مسلکِ اہلِ سنت کے مطابق ہو رہی تھیں، کئی لوگوں کو عین اُس وقت جب وہ تکبیر پڑھ رہے ہوتے، اِس بات پر ٹوک بلکہ سیدھے روک دیا کہ تمہاری داڑھی پوری نہیں ہے، تم سے تکبیر پڑھنے کے لیے کس نے کہا۔ نتیجتاً اِس بے تکے اندازِ اصلاح کے باعث مسجد کے نمازیوں میں سخت اضطراب پیدا ہو گیا، یہاں تک کہ محلہ کے خالص اہلِ سنت حضرات میں دو گروپ بن گئے، نوبت لڑائی تک پہنچ گئی۔ یہ ایک دو مثالیں ہیں لیکن حلقۂ بریلی کے لوگوں کے عمومی فکر و مزاج کی نمائندہ ہیں۔ قارئین کو ایسی بلکہ اِن سے زیادہ عجیب و غریب مثالیں بکثرت معلوم ہوں گی۔

ہمیں کہنا یہ ہے کہ کیا ضرورت ہے اِس بھونڈے تشدد کی۔ جب کہ اِن میں بعض چیزیں وہ ہیں جو شعارِ سنیت نہیں، شعارِ حلقۂ بریلی ہیں۔ اگر یہاں فی صد پر نظر رکھی جاتی تو لوگوں میں ائمہ کی طرف سے برگشتگی پیدا نہیں ہوتی۔ مگر کچھ لوگ ایسے بے حکمت رویے کے خوگر ہیں کہ سدھرنے کا نام نہیں لیتے۔ مذکورہ مثالوں میں آخر الذکر دونوں اماموں کو ہی اپنی امامت سے ہاتھ دھونا پڑا۔ اول الذکر کی امامت برقرار رہی مگر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ لوگ اُس کی حرکت سے کتنے برہم ہوئے ہوں گے۔ عام لوگ یہ تاثر لے کر گئے ہوں گے کہ بریلوی واقعی بڑے فتّین ہوتے ہیں۔ حلقۂ بریلی کے لوگوں کا عمومی مزاج یہ ہے کہ تدریجاً نہیں، دفعتاً سب کچھ کر ڈالنا چاہتے ہیں۔ غیروں کو تدریجاً قریبِ سنیت کرنے کے بجائے دفعتاً اور دو قدم مزید آگے بڑھ کر سیدھے بریلوی بنانا چاہتے ہیں۔ یقیناً آر پار کی جنگ کے مزاج نے سنیت پر بڑا ظلم ڈھایا ہے۔

علمائے کبار تک کا مزاج یہی ہے، ذرا کسی کی شکایت ملی، تصدیق بھی ضروری نہیں سمجھیں گے، خبیث و مردود کہنے لگیں گے۔ اُس کے ساتھ روزِ اول ہی سے وہ سلوک کریں گے جو کسی حقیقی گستاخِ رسول کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ دراصل حلقۂ بریلی میں فروغِ دین کی لفظی یا دماغی ضرورت کا جس قدر بھی احساس جتایا جائے مگر زمینی طور پر یہ جماعت اِس کے لیے کبھی دردمند دکھائی نہیں دی۔ کہا جاتا ہے ضرورت ایجاد کی ماں ہے، علمائے بریلی کو کبھی دعوت و تبلیغ کی ضرورت کا احساس نہیں ہوا، نتیجتاً اُنہیں حکمتیں نہیں آئیں۔ جس کا دو طرفہ نقصان ہوا، دوسرے قریب نہیں ہوئے، اپنے دور ہوئے۔

بہت سی خانقاہیں اور تاریخی شخصیتیں ہم سے چھوٹ گئیں۔ صرف اِس وجہ سے کہ اپنی تاریخی اہمیت و عظمت کے باعث وہ بریلوی نہیں بن سکیں، جب کہ ہم اِس سے کم پر راضی نہ ہو سکے۔ فی صد پر

نظر نہ رکھنے کی وجہ سے ہم نے اپنے کو اتنا الگ تھلگ اور جداگانہ کر لیا کہ جو اختلاف سنی وہابی یا سنی دیوبندی کی شکل میں شروع ہوا تھا، وہ آج دیوبندی بریلوی کا ظاہرہ پکڑ گیا۔ جب کہ ہم صرف مسلمان اور سنی ہیں۔ باقی دوسرے فرقے جو ہوں۔ مگر ہم نے اپنے گروہی تحفظات پر سختی دکھائی اور اُنہیں حدودِ فاصلہ بنا لیا۔ داخلِ اہلِ سنت کسی کا حقِ اختلاف تسلیم نہیں کیا، مزید اپنے آپ ہی کو سنی یا اصل سنی متصور کرنے کی غلطی کی، اِس سے ہم عام مسلمانوں میں شامل نہ سمجھے گئے۔ فی صد پر نظر نہ رکھنے سے وہ پچاس ساٹھ فی صد مسلم عوام ہماری اور ہمارے ساتھ مسلکِ حق کی طاقت نہ بن سکے جو دس پندرہ پندرہ فی صد دیوبندیوں اور بریلویوں کے جھگڑوں سے بے نیاز 'مسلکی' نہیں بلکہ اسلامی زندگی گزار رہے ہیں۔ یہ عوام سنی ہیں مگر اِن پر بریلویت کا ٹیگ نہیں لگایا جا سکتا۔ ہمیں فی صد پر نظر رکھتے ہوئے اِنہیں اُسی شکل میں قبول کرنا پڑے گا، ہاں بقدرِ ضرورت اصلاحی عمل جاری رکھا جائے۔

حق گوئی اور بے باکی یہ نہیں

داعی و مبلغ جب اپنے مشن پر نکلتا ہے تو اُس کے پیشِ نظر ایک صالح مقصد ہوتا ہے۔ فی نفسہٖ وہ کسی کو منھ توڑ جواب دینے کے لیے نہیں نکلتا۔ اُس کا مقصد محض بحث و مناظرہ بھی نہیں ہوتا۔ نہ مظاہرۂ حاضر جوابی غرض ہوتی ہے۔ علمی قابلیتیں اور استدلالی صلاحیتیں کتنی ہی بڑی نعمت سہی مگر رئیس المقاصد اُن کا اظہار بھی نہیں ہوتا۔ دین کے داعی و مبلغ کا اصل مقصد لوگوں کو اللہ سے قریب کرنا، اُن کے دلوں میں حق کو راسخ کرنا اور اُن کے اعمال و جوارح کو صالح کرنا ہوتا ہے۔ باقی جتنی چیزیں ہیں سب مقصدِ مقدس کے حصول کے ذرائع ہیں۔ اُن کا استعمال ضرورتاً ہوتا ہے، زائد از ضرورت نہیں۔ دین کے داعی و مبلغ کے مشن کا تقاضا ہوتا ہے کہ اصل اور بنیادی توجہ حصولِ مقصد پر ٹکی رہے۔

دعوتی و تبلیغی سفر میں نئے نئے لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوتا ہے، جن کی علمی و ذہنی صلاحتیں یکساں نہیں ہوتیں، اِس دنیا میں اُن کے بہت سے تجربے بھی مختلف ہوتے ہیں اور تجربوں کی رعایت سے سطحِ ذہن پر مرتسم ہونے والے اثرات بھی گونا گوں۔ ایک داعی کو بڑے جذباتی لوگ بھی ملیں گے، بڑے ضدی، ہٹ دھرم اور منھ پھٹ بھی۔ وہ بھی ملیں گے جو چاہیں گے کہ پلکوں پر بٹھا لیں اور وہ بھی جو رسول اللہ کے ساتھ ہوئے طائف کے تجربے کو یاد دلا دیں گے۔ مگر ایک مخلص اور حقیقی داعی و مبلغ کو ہر حال میں یہ ذہن نشین رکھنا ہے کہ اِن کے پاس آنا ہماری دعوتی ضرورت ہے، ان کے پاس ہم اپنی ضرورت سے آئے ہیں، یہ ہمارے پاس نہیں آئے۔

اگرچہ داعی کی ضرورت میں مدعو کا بھلا ہے مگر جب تک مدعو کو اُس کا احساس نہیں، اُس کے پاس آنا صرف داعی کی یک طرفہ ضرورت ہے۔ جب معاملہ ایسا ہے تو اُس سے بے تکی منھ زوری کیوں کر روا ہوگی، آپ کے لیے اصل چیلنج منھ زوری میں جیت کر آنا نہیں بلکہ مدعو کو کسی قدر حق سے قریب کر کے آنا ہے۔ بعض داعی تُرکی بہ تُرکی جواب کو دعوتِ دین سمجھتے ہیں، حق گوئی و بے باکی تصور کرتے ہیں، وہ خیال کرتے ہیں کہ یہ اِعلائے کلمۃ اللہ ہے، حق کو جھکنے نہیں دیں گے۔ ایسے داعیان محتاجِ اصلاح ہیں۔

بکثرت ایسا ہوتا ہے کہ کوئی شخص مسئلے کی تفہیم چاہتا ہے، مگر جناب جلد ہی مناظرانہ تیور پکڑ لیتے ہیں، اُس کی ہر بات کا رد اور اپنی ہر بات کا اثبات ہی مقصد بنا لیتے ہیں۔ نرمی اور جھکاؤ کو خیال کرتے ہیں کہ حق کا جھنڈا نیچا ہو رہا ہے۔ ظاہر ہے جب عموماً سامنے والا عالم نہیں ہوتا تو وہ خاموش ہی رہ جائے گا مگر وہ ایسے چترائی بھرے حالات میں بجائے مانوس ہونے کے 'جناب' سے متعلق یہ احساس لے کر نکلتا ہے کہ 'بڑا مکار' ہے۔ دورِ حاضر کے روایتی مقررین نے مزید تباہی مچا رکھی ہے۔ تہی از علم، تہی از خلوص، تہی از مقصد یہ لمبی لمبی فضول تقریریں غیروں کو مزید غیر بنانے کے لیے کی جاتی ہیں۔ عام سماج سخت متنفر ہوتا ہے۔ لوگ ایسے مقرروں کو 'حق بیان' کی جگہ 'شعلہ بیان' کہتے ہیں۔ ایسے مقرروں سے حق نہیں پھیلتا، آگ بھڑکتی ہے، نفرت بڑھتی ہے، سماج جلتا ہے۔

ہمیں اپنے ہی جلسے دیکھ کر سخت کوفت ہوتی ہے۔ ہر مقرر اعصابی تناؤ کا شکار ہوتا ہے اور تھوڑی دیر میں سامعین کو سخت وحشت میں ڈال دیتا ہے۔ سامنے بیٹھی پبلک دینی و اصلاحی خطابات سننے کی پیاسی ہے مگر مقررِ شعلہ بیان بجائے کوئی ٹُنک کی بات کرنے کے، آتے ہی وہ وحشت پھیلاتا ہے کہ جلسہ گاہ جولان گاہِ شمشیر و سناں محسوس ہونے لگتی ہے۔ مقررین پبلک کی سیکورٹی پا کر اسٹیجوں پر بڑے بڑے چیلنج کرتے ہیں۔ بلا لاؤ اُنوں پونوں کو، دو منٹ میں پچھاڑ دوں گا، چھٹی کا دودھ یاد دلا دوں گا، جب کہ بیش تر مقرروں کو شاید ہی گنتی کی آٹھ دس حدیثیں صحیح سند کے ساتھ یاد ہوں۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ جم کر خبیث و مردود کریں گے، جب چلنے کا وقت ہوگا تو یہی شیرِ سنیت منتظمینِ جلسہ سے اچھا ‘‘اجازت’’ دیجیے کہہ کر پہلے سے طے شدہ گراں قدر ‘‘بھاڑا’’ طلب کرتے ہیں۔ بسا اوقات زیادہ رقم اینٹھنے کی کوشش میں اُس سطح تک گر جائیں گے کہ الامان والحفیظ! ۔ یہی ہیں اللہ کے شیر، اِنہیں کو نہیں آتی رُوباہی، یہی ہے حق گوئی و بے باکی۔ ویسے صحیح ہے شیر ہیں، غیر صفتی معنی میں، یعنی یہ نوعِ انسان سے نہیں۔

بعض ڈھیٹ لوگ، حکمت جن کے پاس سے ہو کر نہیں گزری، سویرے ہی دوسروں کو

تاثرات دیتے پھرتے ہیں، بھئی فلاں نے باتیں بڑی کھُلی کھلی کہیں، بدمذہبوں کی ماں بہن ایک کردی۔ دوسری طرف منتظمِ جلسہ برھم لوگوں کو سمجھاتے بُجھاتے نڈھال ہوا جارہا ہوتا ہے، محلے یا بستی میں فروغِ سنیت کی ساری حکمت و تدبیر رائیگاں چلی جاتی ہے، پروگرام کرانے والی انتظامیہ کمیٹی سویرے ہی درہم برہم ہوجاتی ہے، بقیہ خرچ منتظم اپنی جیب سے ادا کرتا ہے۔ امام صاحب کی امامت خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ آئندہ کے لیے جلسے جلوس سب بند۔ پھیل گئی سنیت۔ سچ یہ ہے کہ ترویجِ مسلکِ اہلِ سنت کے لیے آج کے نہایت متمدن دور میں دانتوں اور پنجوں والے شیروں اور چیتوں کی نہیں، علم وحکمت والے انسان مبلغوں کی ضرورت ہے۔

جلسے جلوس سخت اصلاح طلب

جب کسی کی غلط فہمی کا ازالہ مقصود ہو، تو اُس کے ساتھ بے دردی اور قساوتِ قلبی کا مظاہرہ نہیں کیا جاتا بلکہ نرمی ومحبت اور خلوص وہم دردی سے پیش آیا جاتا ہے۔ اُس کے خیال ونظریے میں خامی کیا ہے، یہ سچ سچ اور عادلانہ انداز میں واضح کیا جانا چاہیے۔ ہونا کیا چاہیے، اُس کی قرآن و حدیث اور سلف وخلف کی تصریحات کے مطابق صحیح شکل پیش کرنا چاہیے۔ کسی سے اندھادھندی سے پیش آنا اور آستین چڑھا کر اُس پر چڑھ دوڑنا مسئلے کا حل نہیں۔ پہلے ہی سے مناظرانہ ذہن بنا لینا اور دومنٹ میں پچھاڑ دینے کا جذبہ لے کر ملاقات وبات کرنے سے کسی صورت سنیت کا بھلا ہونے والا نہیں۔ مگر آج حلقۂ بریلی کے جلسے وجلوس عموماً اِسی حالتِ زار کا شکار ہیں۔

جلسے اور جلوس میں تقریریں کی جائیں، تو ذہن میں یہ رکھنا چاہیے کہ یہاں عام پبلک بیٹھی ہے اور اصل حقائق جاننے کے لیے حاضر ہے۔ اِس لیے نہیں کہ وہ کم عقل اور بے وقوف ہے، جلسہ سننے چلی آئی، لہذا اُس کے دل وضمیر اور عقل وخرد سے خطاب کرنے کے بجائے اُس کے جذبات سے کھیلا جائے اور بے تحاشا دہاڑیں مار مار کر اور زبردستی نعرے لگوا لگوا کر اُنہیں فرقِ ضالہ کے خلاف غیر علمی اور محض جذباتی انداز میں ورغلایا جائے۔ دراصل جلسۂ عام کو عدالتِ عامہ تصور کرنا چاہیے، جس کا احترام ضروری ہے۔ جہاں علمی انداز میں مقدمہ رکھ کر اُس پر فطری اور سچ سچ فیصلہ لینا ہے۔ مقررین کو چاہیے کہ وہ دورِ حاضر کے اِس ذوق کو سمجھیں کہ اب آپ سے فیصلہ کوئی نہیں سننا چاہتا، آپ کے پاس جو دلائل ہیں، پیش کیجیے، فیصلہ پبلک کرے گی۔ خود فیصلہ سنانے کا غرہ دماغ سے نکالنا ہوگا۔ مفتیانِ کرام بھی فتاوی جاری کرتے وقت یہ نکتہ ذہن میں رکھیں تو فتاوی کو مزید موثر اور باحرمت بنا سکتے ہیں۔

افسوس کہ آج حلقۂ بریلی کے جلسے عموماً علمیت ومعقولیت کے بجائے شدت وجذباتیت کا شکار ہوکر رہ گئے ہیں۔ جلسوں میں بیٹھ کر احساس ہوتا ہے کہ محفلِ وعظ وتذکیر میں نہیں، میدانِ ضرب وحرب میں بیٹھے ہوئے ہیں جہاں اندھادھند مارکٹائی جاری ہے، پوری فضا دہشت و وحشت، آندھی وطوفان، تباہی وقتل و غارت گری سے شکوہ کناں نظر آتی ہے۔ عموماً تقریریں اتنی بے مقصد ہوتی ہیں کہ خدا کی پناہ!

ہمیں بسا اوقات یہ سوچ کر سخت ذلت محسوس ہوتی ہے کہ یہ ہو رہی ہے ہماری نمائندگی۔ بسا اوقات تقریریں دیکھ کر لگتا ہے کہ یہ قوم کے ساتھ بدتمیزی ہو رہی ہے جسے بہ جبر روکنے کی ضرورت ہے۔ دراصل جماعت کے پیشہ ور مقررین میں زیادہ تعداد اُن لوگوں کی ہے جن پر نہ نفسِ دین و سنیت کا concept کلیئر ہے، نہ فروغِ دین وسنیت کا مقصد واضح۔ چوں کہ بیش تر عوام اور بہت سے علما کے نزدیک یہی طبقۂ مقررین، جماعت کی زبان وترجمان ہے۔ اِس لیے جماعت میں چوپٹ راج قائم ہے۔ دس دس بیس بیس بلکہ تیس تیس چالیس چالیس ہزار روپے کی یہ paid تقریریں جماعت کو داخلی طور پر سخت بے ذوق اور عام سماج کو ہم سے سخت متنفر و بیزار بنا رہی ہیں۔ اصلاح کی آواز سننے کو کوئی تیار نہیں۔ حالاں کہ آوازیں عرصے سے اُٹھ رہی ہیں۔

حلقے کی پیش تر تقریریں قساوتِ قلبی پر مبنی ہوتی ہیں۔ تصور کیجیے، جس قوم کو دوزخ کی آگ سے بچانا ہے، اُس کے ساتھ بجائے ہم دردی اور غم خواری کے کس جارحیت اور شدت سے پیش آیا جا رہا ہے۔ ٹھیک ہے، کچھ لوگ ضدی اور شرارتی ہوتے ہیں، مگر کیا آپ کو اُن کے فاسد یا باطل عقائد کے پیش نظر اُن کے سامنے نارِ جہنم دہکتی دکھائی نہیں دے رہی ہے۔ اگر ہاں تو بڑی بے رحمی کی بات ہے کہ ذرا نامناسب سلوک آپ کو برداشت نہیں، نتیجتاً اپنی اَنا کے لیے اُنہیں بے دریغ دوزخ میں جھونک دینا چاہتے ہیں۔

اندازہ کیجیے، رسول اللہ بھی یہ طرزِ عمل اختیار فرما لیتے تو مشرکینِ مکہ میں سے اِکا دُکا ہی مسلمان ہوتے۔ وہ خلوص، وہ غم خواری، وہ ہم دردی کہ واہ رے ناز برداریِ امت! اللہ نے تسلی کے لیے قرآن مجید میں آیات نازل فرمائیں۔ جب کہ ہم ہیں کہ نہایت بے دردی پر اُترے ہوئے ہیں۔ لاکھوں لاکھ لوگ کنفیوزن کا شکار ہوکر آتشِ جہنم کا ایندھن بن جائیں، ہمیں پروا نہیں، اتنی فکر ہے کہ جلسے میں تقریر جم جائے، فضول بیانی وسرعتِ لسانی سے سامعین متاثر ہوجائیں۔ ہار جیت دماغ میں

بیٹھی ہوئی ہے۔ ہم بھول گئے خلقِ خدا سے محبت کرنا، ہم بھول گئے خلقِ خدا کی خدمت کرنا۔ ایک تو عوام پہلے ہی سے سخت پریشان ہیں، الفت ومحبت اور سچے ایمان وسنیت کے پیاسے ہیں، اُن کے دلوں کی سادہ فطری آوازیں تو سنو، گم شدہ فلاح کی تلاش میں خانۂ دل سے کیسی دردناک صدائیں بلند ہورہی ہیں۔ جب کہ تمہاری قساوت ذرا نرم پڑنے کو تیار نہیں۔

مقرروں نے لہجہ مارنا نہ جانے کہاں سے سیکھ لیا ہے، پوری پوری تقریریں لہجہ بازی میں گزار دی جاتی ہیں، جب کہ کچھ خطبا سرعت اور بے فیض تسلسل کے رسیا ہوتے ہیں۔ پسینہ بہ رہا ہے، آستینیں چڑھی ہوئی ہیں، سر پہ بھیڑ کے بالوں والی نصف کلووزن کی ٹوپی ہے جو آدھی جھکی ہے، گلے میں یوٹرن لیے ہوئے لمبا رومال ہے، جس کے دونوں سرے کبھی جوشِ غضب میں ہاتھ سے پکڑ کر کھینچے جاتے ہیں، کپڑوں کے اُوپر بظاہر بے داغ لمبا سفید جبہ ہے جو سارے عیبوں کو چھپائے ہوئے ہے۔ جب کہ گھی میں تلا ہوا سموچا مرغا کھا کر اور پان کی آخری پیک تھوک کر علم سے نہیں اخلاق سے بھی گری ہوئی زبان میں شیرِ صوبہ سرگرمِ ردِ وہابیہ ہیں۔ حقیقتاً یہ سب اِس بات کی علامت ہیں کہ اب ہمارے پیشِ نظر کوئی دینی مقصد نہیں رہ گیا ہے۔ مزید اِس بات کا ثبوت کہ ہماری پست فکری کی اب کوئی حد متعین کرنا مشکل ہے۔

پیشہ ور نعت خوانوں پر بھی قوم کے پیسے کو خوب ضائع کیا جاتا ہے۔ کیا ضرورت ہے پندرہ پندرہ بیس بیس ہزار کے نعت خوانوں کو بلانے کی۔ کسی بھی پروگرام میں دو خطبا اور ایک نعت خواں سے زیادہ کا وقت نہیں ہوتا مگر بدنظم دھاندلی کا کیا کہیے۔ ایک بھیڑ جمع کر لی جاتی ہے، کبھی کبھی دیکھا جاتا ہے کہ تقریر و نعت خوانی کے اُمیدواران، سامعین کی مجموعی تعداد کو چھو رہے ہیں۔

مثالی تقریریں ہمارے مرکزی اسٹیجوں پر بھی نہیں ہوتیں۔ مرکزی اسٹیجوں کی بیشتر تقریروں کی افادیت پر سوالیہ نشان لگتا ہے۔ اُن اسٹیجوں پر عموماً وہی پھوہڑ مقررین دس دس پندرہ پندرہ منٹ ہائے توبہ مچاتے ہیں جو سال ہا سال تقریروں کے نام پر قوم کو لوٹ رہے ہوتے ہیں۔ بقول نقیبانِ اجلاس مرکزی اسٹیجوں پر دس پندرہ منٹ پیشہ ور مقرروں کی اُچھل کود، اگلے عرس تک کے لیے اُن کا معاشی مستقبل محفوظ کر دیتی ہے۔ ایسا ہے بھی، تقریر میں صحیح سے ایکٹنگ کر لی گئی تو کئی پروگراموں کی تاریخیں اسٹیج سے اُترتے ہی فکس ہو جاتی ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ حلقۂ بریلی کے عام لوگ کہاں سے نمونہ حاصل کریں۔ مرکز وشاخ سب کے اسٹیجوں کی حالت ناگفتہ ہے۔ جس کا مطلب ہے

کہ جماعت کے سربراہان اپنے جلسوں کی اصلاح کریں۔

ردِ بدعات ومنکرات

اِس میں دورائے نہیں کہ جس قدر مسلمان خود اپنے دینِ حق کے پابند ہوں گے، اُسی قدر دوسروں پر اُن کی دعوتِ دین زیادہ موثر ہوگی اور غیروں میں قبولِ اسلام کی رفتار تیز ہوگی۔ رسول اللہ کا روشن کردار ہی تھا جس کے باعث اشاعتِ اسلام کی لو تیز تر ہوئی۔ صحابہ اور بعد میں صالحین اور علمائے ربانیین کے پاکیزہ کردار وعمل سے فروغِ اسلام کی تحریک کو تقویت ملی۔ یہ نفوسِ قدسیہ قبولِ اسلام کرنے والے ہر شخص کو پہلے علمی دلائل سے زیر نہیں کرتے تھے۔ بلکہ عموماً بڑی سادہ سی دعوتِ حق دیتے تھے۔ البتہ عمل زیادہ کر کے دکھاتے تھے۔ لوگ متاثر ہو کر اسلام لے آتے تھے۔ بیش تر ایسا ہوا کہ صالحین نے کبھی دعوتِ اسلام نہ دی مگر اُن کے للّٰہیانہ شب وروز دیکھ کر اور خدمتِ خلق ومحبتِ خلق کے جذبے سے متاثر ہو کر نہ جانے کتنے لوگ از خود قبولِ اسلام کے لیے پیش ہو گئے۔ لیکن جیسے جیسے مسلمانوں میں بے عملی عام ہوئی، اسلام کی اشاعت کی رفتار ماند پڑتی چلی گئی۔

یہی مسئلہ فروغِ مسلکِ اہلِ سنت کے ساتھ ہوا۔ میلاد وعرس، نذر و فاتحہ، تیجہ و چالیسواں وغیرہ صحیح شکل کے ساتھ معمولاتِ اہلِ سنت ہیں۔ مگر آج عوامِ اہلِ سنت کے درمیان کچھ ایسی چیزیں در آئی ہیں جو نہ صرف خلافِ شرع ہیں بلکہ معمولاتِ اہلِ سنت پر حرف گیری کا باعث ہیں۔ عام لوگ جو کسی چیز کو عموماً اُس کے اصل مصادر سے پڑھ کر نہیں، ظواہر سے متاثر ہو کر قبول کرتے ہیں، علم وتمدن کے اِس دور میں جب بعض عوامِ اہلِ سنت کو معمولاتِ اہلِ سنت کے نام پر بعض صریح خرافات و منکرات میں ملوث پاتے ہیں تو غلط فہمی کے باعث براہِ راست مسلکِ اہلِ سنت کے تعلق سے منفی فیصلہ کر لیتے ہیں، موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے دیگر مسالک کے لوگ مزید جلتی میں تیل کا کام کرتے ہیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بہت سے حضرات سرے سے اصل مستحسنات کے بھی خلاف ہو جاتے ہیں۔

ایسے میں ہونا تو یہ چاہیے کہ ردِ باطل کے ساتھ ہم اپنے حلقے میں پھیلی خرافات ومنکرات کے ازالے کی بھی سخت کوشش کریں، کچھ لوگ کوششیں کرتے بھی ہیں، مگر اِس سلسلے میں عدم دل چسپی عام ہے۔ حالاں کہ یہ بات قطعی طور پر معلوم ہے کہ معترضین کچھ اسی طرح کی چیزوں کے باعث اہلِ سنت پر طنز وتعریض کرتے ہیں اور عموماً اُنہیں خرافات ومنکرات کو دکھا دکھا کر عام مسلمانوں کو مسلکِ اہلِ سنت ومعمولاتِ اہلِ سنت کے خلاف کرتے ہیں۔ یہی چند خرافات اہلِ سنت کے خلاف اُن کا

سب سے بڑا ہتھیار ہیں۔ مگر ہم ہیں کہ سمجھنے کو تیار نہیں۔

اغیار نے بڑی حکمت سے سنی دیوبندی یا سنی وہابی اختلاف کے اصل رخ کو فروع کی طرف پھیر رکھا ہے۔ چند مستحسنات جن میں بعض عوامِ اہلِ سنت نے اپنی سطح پر بعض تجاوزات کو شامل کر لیا ہے، اب سنی وہابی اختلاف کی اصل تصور کیے جانے لگے ہیں۔ یہ مستحسنات عموماً فرض و واجب نہیں، صرف جائز و مستحب ہیں، مگر عوام نے شوشے گوشے نکال کر ایک تو اُنہیں بہت بڑھا چڑھا لیا، دوسرے کہیں کہیں واضح تعدیِ حدود کرتے ہیں۔ نتیجتاً عملی میدان میں دورانِ بحث علما کو بسا اوقات سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اگرچہ نظریاتی سطح پر اصل جائز کا نفسِ جواز و استحباب ثابت کرنے میں وہ معترضین پر حاوی رہتے ہیں۔ مگر پبلک کو منطق نہیں آتی، وہ بہت موٹے اصولوں پر فیصلہ لیتی ہے۔

ایسے میں داعیانِ سنیت کو دوطرفہ جہاد کرنا چاہیے، ایک طرف علم و سنجیدگی کے ساتھ فرقِ ضالہ کے مکروہ افکار و نظریات کا رد کریں، دوسری طرف اُتنی ہی طاقت سے ردِ بدعات و منکرات کریں۔ ہمیں حیرت ہے کہ علماے اہل سنت حلقۂ بریلی، داخلِ اہلِ سنت منکرات کے رد و ابطال پر سنجیدہ کیوں نہیں۔ عرس و مزار، تیجہ چالیسواں اور عاشورہ وغیرہ پر اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ کی بے حد نپی تلی تحریریں پڑھنے سے ایمان تازہ ہو جاتا ہے، مخالفین بھی پڑھ لیں تو نقشِ حیرت بنے رہ جائیں۔ لیکن نہ جانے کیوں ہمارے علما خالص رضوی اصطلاحات کے نفاذ کے لیے بھی سنجیدہ نہیں۔ ہمیں بڑی تلخ وجہ یہ نظر آتی ہے کہ ہم نے اپنے معتقد عوام کو شروع ہی سے اتنی ڈھیل دے رکھی ہے کہ اب اگر عین تحریراتِ رضا کے مطابق اصلاح کی گئی تو وہ کنفیوز ہوں گے کہ آیا یہ لوگ ’’شعارِ سنیت‘‘ کے خلاف کیوں آواز اُٹھا رہے ہیں۔

لیکن سچ بہرحال سچ ہے۔ ہمیں اپنی کمزوری بلا جھجک دور کرنا چاہیے۔ اِس لیے بھی کہ ہماری اصل جنگ غلط و فاسد یا باطل سے ہے وہ جس کے اندر بھی ہو۔ اور اِس لیے بھی کہ ہمارے خلاف عوام کی عدالت میں منفی پروپیگنڈوں کے سب سے بڑے ہتھیار مخالفین کے پاس یہی چند منکرات ہیں۔ یہی چند خرافات ہیں جو عرصے سے فروغِ سنیت کی رفتار پر قدغن لگاتی آ رہی ہیں۔ اِنہیں کی آڑ میں بعض گم راہ فرقے اپنے باطل خیالات و نظریات کا فروغ کر رہے ہیں۔

عام طور پر حلقۂ بریلی کے حضرات رائج خرافات پر یہ حیلہ کرتے ہیں کہ یہ عوام کرتے ہیں، مسلکِ اہلِ سنت سے اِن کا کوئی تعلق نہیں، مگر سوال یہ ہے کہ مسلکِ اہلِ سنت سے تو مسلکِ نجد و دیوبند کا بھی کوئی تعلق نہیں، پھر اُن کے رد کے لیے کیوں کوشاں رہتے ہیں۔ حالاں کہ یہ معلوم ہے کہ

فکری گم راہیوں کی ترویج میں رائج مذکورہ چند خرافات کا بڑا حصہ ہے، خرافات کا اِزالہ ترویجِ فکرِ باطل کی تحریک کو زک اور ترویجِ سنیت کی تحریک کو طاقت دے گا۔ عموماً یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کرتے تو ہیں، بتانے ہی کا کام تو ہے، جاہل نہیں چھوڑتے تو کیا کریں۔ لیکن سچ یہ ہے کہ ہماری جماعت کے لوگ صرف ردِ وہابیہ کے لیے مخلص ہیں، حکمتیں گرچہ وہاں بھی مفقود ہیں۔ جب کہ دیگر مراحل پر کوششیں ہی نہیں کرتے، صرف جی چراتے ہیں، محض باتیں بنا دیتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اگر کسی بستی یا شہر کے کسی محلے میں کسی دیگر فرقے کی طرف سے کوئی تقریر ردِ عرس و فاتحہ پر ہو جائے یا کوئی کتابچہ سامنے آ جائے تو علی الفور اُس کا نوٹس لیا جاتا ہے، جو اگرچہ درست جذبہ ہے مگر دوسری طرف اُسی بستی یا محلے کے سنی عوام کتنی ہی ڈٹ کر تعزیہ داری کریں، ہزار خرافات منائیں، مزاراتِ مقدسہ پر کتنا ہی فتنہ انگیز اختلاطِ مرد و زن بڑھائیں، عرسوں میں قوالنوں کو بلائیں، اسٹیجوں پر بٹھا کر اُن سے جنس انگیز غزلیں سنیں، فرضی مزارات تعمیر کریں، مال دار لوگ تیجے اور چالیسویں خوب کھائیں، اِن پر کوئی ایکشن نہیں لیں گے، نہ اِن کے خلاف کھل کر تقریریں کریں گے، نہ کتابچے لکھیں گے (الا ماشاء اللہ)۔ یہاں مصلحتیں یاد آنے لگتی ہیں کہ کچھ لوگ مدرسے کی کمیٹی کے ہیں وہ ناراض ہو جائیں گے، میری امامت خطرے میں پڑ جائے گی، میرے چچا وغیرہ کا مسئلہ ہے، میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ جب کہ ضال فرقوں سے مصادمت کا مسئلہ آن پڑے تو ساری مصلحتیں کافور، عمل کے لیے فوراً مخلص ہو جائیں گے۔ غرض ردِ منکرات پر اعتذار میں مخلص نہیں ہوتے ہمارے لوگ۔

وصیتِ رضا کی وضاحت

اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ نے مسلمانانِ اہلِ سنت سے اپیل کی ہے کہ جس کسی کے اندر توہینِ رسالت کا ذرا بھی شائبہ پاؤ، پھر وہ تمہارا کیسا ہی قریبی کیوں نہ ہو، اُسے اپنے سے ایسے دور کر دو جیسے دودھ میں سے مکھی نکال کر پھینک دی جاتی ہے۔ اعلیٰ حضرت کی یہ وصیت ایمان افروز ہے۔ مگر یہ وصیت اُسی کے ساتھ روا رکھی جا سکتی ہے جو کسی قدر توہینِ انبیا کا مرتکب ہو۔ اِس لیے اِس رویے سے قبل متعلقہ شخص کے بارے میں الزام کی صداقت پر نہایت خداترسانہ اطمینانِ قلب ضروری ہے۔ اگر یہ اطمینانِ قلب ہے اور یہ تصدیق ہے کہ فلاں توہینِ انبیا کا ذہن رکھتا ہے تو معاملہ صاف ہے۔ لیکن یاد رہے گروہی تعصب کے اِس زمانے میں گروہِ آخر کے کسی بھی فرد پر الزام تراشی بے حد آسان

سمجھی جاتی ہے۔ اِس لیے ایک منصف کے لیے یہاں اِس الزام کی تصدیق اِسی قدر مشکل بھی ہے۔

مثالاً عرض کروں کہ ہمارے ہی بعض احباب اپنے بعض احباب پر ذاتِ اعلیٰ حضرت اور عظمتِ بریلی سے حسد وجلن کا الزام دیتے ہیں، حالاں کہ یہ نہایت بے بنیاد ہے مگر الزام تراش حضرات کے نزدیک حقیقت ہے۔ اب یہاں کون طے کرے کہ سچ کیا ہے۔ اصل یہ ہے کہ عموماً غلط فہمیوں کے نتیجے میں ایسا ہوتا ہے، افہام وتفہیم کا راستہ اختیار نہیں کیا جاتا کہ مسئلہ سلجھے، یا واقعی ایک شخص ملزم نہیں بلکہ مجرم ہے تو اُس پر اطمینانِ قلب حاصل ہو، جس کے بعد اُس کے ساتھ وہی سلوک کیا جائے جس کا وہ شرعاً مستحق ہے۔ عموماً دور رہ کر ہوائی فائرنگ کی جاتی ہے۔ یقیناً ایسی صورتوں میں نفس گرچہ مطمئن ہو جائے مگر ایمان مطمئن نہیں ہوتا۔ ہم یہاں دو خاص صورتوں کی وضاحت کریں گے جس میں عموماً کسی کی طرف سے توہین کا شبہ ہوسکتا ہے۔ اہلِ علم ونظر کو مزید دعوتِ غور وفکر دی جاتی ہے:

(1) وقتی جذباتیت کے زیرِ اثر:______ اِس کا مطلب یہ ہے کہ کسی مسئلے میں بحث طول پکڑ گئی، کوئی سخت طعنہ دیا، کسی بات کے تسلیم کرانے پر اصرارِ شدید کر ڈالا گیا، نتیجتاً سامنے والا غصے میں آپے سے باہر ہو گیا اور کوئی مشعرِ جذبۂ مکروہ یا واضح کلمۂ توہین زبان سے نکال دیا، حالاں کہ اِس سے پہلے کبھی اُس سے ایسی بات نہیں سنی گئی، نہ عموماً وہ ایسا دِکھتا تھا، فرقۂ ضالہ کے لوگوں سے ضرور متاثر تھا۔ سوال یہ ہے کہ کیا اُس کے ساتھ وصیتِ اعلیٰ حضرت کے مطابق سلوک کیا جائے گا۔ یہاں ایک بات تو صاف ہے کہ اُس نے کلمۂ حرام یا کلمۂ کفر زبان سے ادا کیا جس پر دیگر ضروری احکامات مثلاً توبہ وتجدیدِ ایمان وغیرہ لازماً جاری ہوں گے۔

یہاں ایک نکتہ یہ ہے کہ بہت سے مسلمان جو بلاشبہ اللہ کی قدرت ومشیت پر ایمان رکھتے ہیں، کسی سے بحث کے دوران وقتی جذباتیت یا کسی تکلیف وغم کے احساس کی شدتِ شدیدہ سے مغلوب ہو کر خود پر قابو نہیں رکھ پاتے اور تھوڑی دیر کے لیے بدبختانہ جہالت پر اُتر آتے ہیں، بسا اوقات کلماتِ کفر زبان سے بک ڈالتے ہیں جن پر شرعی احکامات بھی جاری ہوتے ہیں۔ مفتیانِ کرام کے پاس ایسے گوناگوں سوالات آتے رہتے ہیں جن کی فتاویٰ کی کتابوں میں مثالیں دیکھی جاسکتی ہیں کہ بارش نہ ہوئی، کوئی مصیبت آن پڑی، کچھ اور ہوا تو نعوذ باللہ، جنابِ باری تعالیٰ میں کلمۂ کفر بک ڈالتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ایسے لوگ جو اللہ جل شانہ اور بارگاہِ رسالت میں وقتی غلبۂ خبط کے زیرِ اثر غلط کلمات بول جاتے ہیں، توبہ وتجدید کے علاوہ مزید کسی خاص دائمی سخت سلوک کے بھی ہم سے مستحق ہیں؟

(2) سماجی دیوبندیت:______ یعنی ایسا شخص جو دیوبندیت سے ضرور متاثر ہے مگر اساسی عقائد کی سطح پر نہیں۔ اُس نے کلمۂ کفر کبھی نہیں کہا مگر چوں کہ سماجی سطح پر دیوبندی شمار ہے۔ اِس لیے خیال کر لیا جائے کہ یقیناً گستاخیِ رسول کرتا ہوگا اور اُس کے دل میں توہینِ رسالت کا جذبہ لازماً موجود ہوگا۔ لہٰذا اُس کے ساتھ بھی وصیتِ اعلیٰ حضرت کے مطابق سلوک کیا جائے گا۔ لہٰذا جتنے بھی بلا امتیاز عقائدی وسماجی سطح کے متاثرین ہیں، بلاتحقیقِ مزید یقینی طور پر سخت رویے کے مستحق ہوں گے۔

غرض یہ دو صورتیں ہوئیں۔ جن پر آخری فیصلہ تو علمائے کبار ہی دیں گے مگر جہاں تک ہمارا خیال ہے دونوں صورتوں میں قدرِ مشترک یہ ہے کہ دل وضمیر میں مستقل توہین کا جذبہ موجود ہو، یہ یقینی نہیں۔ صورتِ اول میں صرف وقتی سانحہ کے باعث شخصِ متعلق کے تئیں یہ یقین کر لینا کہ توہینِ رسالت اُس کا دائمی جذبہ ہے، ضرورت سے زائد کا یقین کر لینا ہے۔ جب کہ صورتِ ثانی میں محض نسبتِ دیوبندیت رکھنے کے باعث بلا امتیاز لاکھوں لاکھ لوگوں کو مرتکبینِ توہینِ رسالت قرار دینا خالص سوءِ ظن، بلکہ تعدیِ حدود ہے۔ تجربات کے بھی خلاف ہے۔

صورتِ ثانی میں نرمی کرنے اور بدگمانی سے بچنے کی تائید علما کی اُس تاویل سے بھی تائید ہوتی ہے جو اُوپر کہیں گزری کہ چوں کہ وہ علمائے دیوبند سے اُن کے اصل عقائدِ قبیحہ یا عباراتِ شنیعہ سے متعلق علم وجان کاری رکھے بغیر متاثر ہوتے ہیں، اِس لیے قائدۂ من شک کے تحت اُن کی تکفیر نہیں کی جاسکتی۔ یہ تاویل بایں طور موید ہے کہ علما نے عام لوگوں کو تکفیر سے بچایا ہے جس کا مطلب ہے کہ نہ علما کو اِس پر یقین ہے کہ یہ لوگ بہ ذاتِ خود توہینِ انبیا کرتے ہیں یا دل میں بہ ذاتِ خود توہین کا جذبہ رکھتے ہیں، نہ اِس پر اعتماد کہ یہ لوگ مخصوص علمائے دیوبند کی توہین آمیز عباراتِ شنیعہ کی جان کاری رکھتے ہوئے علمائے دیوبند کو صحیح سمجھتے اور اُن سے عقیدت رکھتے ہیں۔ آسان لفظوں میں یوں سمجھیے کہ علما نے نہ اِن لوگوں کو بلاواسطہ مرتکبینِ توہینِ رسالت قرار دیا، نہ بالواسطہ۔ بالواسطہ جہاں یہ لوگ گرفتِ فتویٰ آسکتے تھے، وہاں علما نے اُنہیں حقائق سے بے خبر اور لاعلم قرار دے کر معذور تسلیم کیا ہے۔

تو جب یہ بات صاف ہوگئی کہ یہ عوام جنہیں بہت حد تک اعتقادی نہیں بلکہ ’سماجی دیوبندی‘ کہا جاسکتا ہے، کسی بھی طرح توہینِ رسالت کے مرتکبین کے ضمن میں نہیں آتے، تو بجائے اصلاحِ خیر خواہانہ کے اُنہیں اپنے دائرۂ ربط وتعلق سے بہ یک دفعہ مکھی کی طرح نکال کر پھینک دیا جانا

بھی مناسب نہیں، نہ یہ وصیتِ رضا پر عمل ہے۔ اِس رویے کے جواز کے لیے توہینِ رسالت کی شرط مفقود ہے۔ ایک بات یہ درست ہوسکتی ہے کہ اُن میں جو لوگ شریر ہو سکتے ہیں، اُن سے عوام کو بہر حال بچایا جائے مگر علما کو چاہیے کہ وہ نرمی اور ہم دردی کے جذبے سے اُن کی تفہیم و اصلاح کریں۔ دھتکارنے اور اظہارِ نفرت کرنے کے بجائے اُن کی غلط فہمی دور کر کے اُن کو اپنے سے قریب اور سنیت سے مانوس کریں۔

لیکن اگر بہر صورت مطابقِ وصیتِ اعلی حضرت سلوک پر اصرار ہے تو عرض ہے کہ پھر یہ وصیت دورِ حاضر کے لیے کلی نہیں رہی، یہ منسوخ یا موقوف ہے۔ کیوں کہ زمانۂ اعلی حضرت کے برخلاف آج بلاتفریقِ اعتقادی و سماجی، گمراہان کی تعداد کہیں زیادہ ہے، ماضی کے برخلاف آج یہ لوگ ہمارے ہر شہر، بستی، محلہ، خاندان، بلکہ گھروں تک میں موجود ہیں، دو بھائی آپس میں الگ الگ ذہن رکھتے ہیں یا باپ اور بیٹے میں نظریاتی اختلاف ہے۔ ایسے میں ہمارے سلوک کا منفی اثر خود ہم پر، ہماری سنیت پر، کوششِ فروغِ سنیت وغیرہ پر پڑے گا، یعنی ہمیں اور ہمارے پیارے مسلکِ اہلِ سنت کو منفی تصور کیا جائے گا جو نتیجے کے اعتبار سے بہتر نہیں۔ ایسا سمجھ لیجیے کہ جب ہمارے گھروں میں ہمارے دشمن پیدا ہو جائیں، بھائی بھائی کا دشمن ہو جائے، بیٹا باپ کے سخت خلاف ہو جائے، تو شدت و جذباتیت سے نہیں حکمت و دانائی سے کام لینا ہی تقاضاے وقت ہے۔

(3)

صاف گوئی کا تقاضا کرے ایماں مجھ سے

اسلام کی فطرت-فروعی اختلافات کی اجازت

اللہ تعالیٰ نے انسان کی رہ نمائی کے لیے دینِ اسلام کو نازل فرمایا ہے۔ جو مکمل دستورِ حیات ہے، یہ بہت جامع بھی ہے، بہت واضح بھی۔ اِس کے اندر اہلِ نظر متخصص کے لیے بہت سے جزئیات ہیں، مگر موٹے طور پر اسلام بہت سادہ اور واضح ہے۔ یہاں تک کہ صرف کلمۂ طیبہ کے اقرارِ لسانی و تصدیقِ قلبی سے ایک غیر مسلم مسلمان بن جاتا ہے۔ ہاں اسلام کی ضروریاتِ اساسی ہیں جن کی اپنی تفصیل ہے، جن کا رفض و انکار کفر ہے، یعنی آدمی مسلمان نہیں رہتا۔ کچھ اِسی طرح کی بنیادوں پر ادعاے اسلام کرنے والوں میں فرقے بن گئے جن میں بعض کفر و ارتداد کی حد کو پہنچ گئے۔ فرمانِ نبوی کی روشنی میں جماعتِ اہل سنت ہی جماعت حقہ ہے، باقی جتنے فرقے ہیں، گم راہ ہیں، بعض کافر ہیں۔

لیکن فی الواقع بعض بنیادی چیزوں کے حصول کے بعد اسلام اپنے اہل پیروکاروں کو خلوصِ نیت کی شرط پر ترجیحی اختلافات کے لیے آزاد قرار دیتا ہے، یہی وجہ ہے کہ جز جز میں اتحاد نہ عہدِ رسالت میں ہوا، نہ عہدِ صحابہ میں، نہ آج تک ہوا ہے۔ دراصل یہ فطرت ہے جسے بتمام کوشش بدلا نہیں جا سکتا، یہ انسان کی جان و عقل کے ساتھ قائم ہے۔ اللہ نے اِس بوقلموں فطرت میں حکمتیں رکھی ہیں۔ اِسی فطرتِ سلیمہ کی بنیاد پر اختلاف کو رسول اللہ نے امت کے لیے رحمت قرار دیا ہے۔ امتِ مسلمہ کے درمیان مختلف سطحوں پر اختلافات کی واضح مثالیں اشعری، ماتریدی (کلام)، حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی (فقہ)، قادری، چشتی، سہروردی، نقش بندی (سلوک) ہیں۔ اِس میں بعض بزرگوں کی طرف سے اپنے طبعی مزاج کے باعث سختی و تلخی کا بھی مظاہرہ ہوا۔ مگر پروردگارِ عالم نے بلا اختلاف سب کو ہمیشہ چشمِ رحمت سے دیکھا۔ قدرت نے اپنے بندوں کے جائز اختلاف کو کرشمۂ فطرتِ سلیمہ قرار دیا جو حقیقت ہے۔

ہر اختلاف کے خلاف جنگ-فطرت کے خلاف جنگ

اِس مختصر تمہید کے بعد ہمیں کہنا یہ ہے کہ آج بعض اہلِ سنت یعنی حلقۂ بریلی کے درمیان مسلک کے نام پر جو مکروہ جنگ چھڑی ہوئی ہے وہ سراسر غلط اور ناسمجھی پر مبنی ہے۔ اولاً اِس میں یہی

بنیادی کم زوری ہے کہ یہ فطرت کے خلاف جنگ ہے۔ فطرت یہ ہے کہ لوگوں کے افکار و خیالات میں اختلاف ہوگا، جب کہ ہم یہ کوشش کر رہے ہیں کہ اختلاف بہ لفظِ دیگر فطرت کو ختم کر دیں، جو ناممکن ہے۔ اللہ نے فطرتِ سلیمہ تک میں رنگارنگی رکھی ہے تو وہ کیوں کر ختم ہوگی۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ اللہ نے اپنا دینِ اسلام دینِ فطرت کے سانچے میں ڈھال کر نازل فرمایا ہے جس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ دین کے اندر بھی رنگارنگی لازماً ہوگی۔

دوسری طرف دینِ اسلام کے اصول بڑے کڑے اور قطعی رکھے گئے ہیں۔ یہاں اِس بات کی اصلاً گنجائش نہیں کہ جب یہ ثابت ہو جائے کہ یہ اللہ کا فرمان ہے، تو اُس کا رفض یا تحقیر کر کے داخلِ اسلام رہنے کا دعوی بحال رکھا جائے۔ ایک مومن کے لیے یہی اصل چیلنج ہے کہ وہ دینِ اسلام اور فطرتِ سلیمہ دونوں کے درمیان حکیمانہ و مومنانہ تطبیق دے۔ دین کی وہ توجیہ نہ کرے کہ خلافِ فطرت ٹھہرے، لوگ برگشتہ ہونے لگیں۔ نہ فطرت کی غلط توجیہ سے اُس کو اِس طرح کے نتائج پر آمادہ کرے۔ معلوم رہے کہ دینِ اسلام میں جو کشادگی ہے وہ مسلک یا مسلکِ اہل سنت میں نہیں۔ مسلکِ اہل سنت میں جو کشادگی ہے وہ کسی ایک سنی شخصیت کے منہجِ خاص میں نہیں، کشادگی ہی کیا سخت تحدید اور چست درست پن بھی نہیں۔

داخلی اختلافات عزیمت و رخصت پر مبنی

خالقِ کائنات حکیم ہے، اِس لیے جب اُس نے ساری دنیا کے لیے دینِ اسلام کو بشکلِ دین نازل کیا تو اُسے ایک بنیادی اور دائمی اصول سے جوڑ دیا، اُسے ہر طرح کے اِفراط و تفریط سے پاک کر کے مطابقِ فطرت کر دیا۔ ہم مسلکِ اہل سنت ہی پر غور کریں، اِس کا درجہ بعدِ اسلام ہے، یوں سمجھیے کہ خروجِ اسلام کفر مگر خروجِ مسلکِ اہل سنت بدمذہبی۔ ہاں بسا اوقات کفر بھی ہو سکتا ہے، ویسے اِسے خروجِ اسلام ہی کے دائرے میں رکھنا چاہیے تاکہ درجہ بندی قائم رہے۔ داخلِ مسلک اختلافات بایں طور روا ہیں کہ فطرتِ سلیمہ بوقلموں ہے۔ مگر دینِ اسلام کے نام پر اللہ نے یا مسلکِ اہلِ سنت و جماعت کے نام پر رسول اللہ نے جو دائمی اور اٹل اصول بنا دیے، ہدایتِ ابدی و جنتِ سرمدی کا دار و مدار اُنہیں اصولوں پر ہوگا۔ داخلِ مسلک اختلافات کی حیثیت اِس سے زیادہ نہیں کہ بعض عزیمت اور بعض رخصت پر مبنی ہوں، خلوصِ نیت کی کمی زیادتی کی رعایت سے کم یا زیادہ ثواب مرتب ہو سکتا ہے۔ اِس میں کفر یا بدمذہبی کی گنجائش نہیں۔ حلقۂ بریلی کے حضرات کے درمیان

تازہ اختلاف یا تشدد کی لہر دراصل اِسی نکتے کو نا سمجھنے کا نتیجہ ہے۔

اصل یہ ہے کہ مسلکِ اہلِ سنت کے خلاف نہ ہو

بلاشبہ اعلی حضرت علیہ الرحمہ عالمی سطح پر ہمارے بلکہ ہر صاحبِ انصاف مومن کے لیے دینی و علمی سرمایہ ہیں۔ آپ کی علمی قابلیتوں کے ساتھ علمی و دینی خدمتیں خوب تھیں جس کے باعث ہمارے دل میں آپ کا بے حد احترام ہے۔ مگر دینی اساس کے طور پر اُن سے اتفاق یا اختلاف کے کوئی معنی نہیں، یہ خالص بے معنی بات ہے۔ بحث اعلی حضرت اور غیر اعلی حضرت سے اتفاق یا اختلاف کی نہیں بلکہ ایک مومن کے لیے یہ ناگزیر ہے کہ وہ دینِ اسلام نیز مسلکِ اہل سنت سے متفق رہے۔ اصل ایمان اور دینی تصلب یہی ہے۔ طبعی طور پر یہ بات باعثِ احساس ہو مگر از روے شرع اِس سے انحراف کی گنجائش نہ اعلی حضرت میں رہی، نہ اعلی حضرت سے اگلوں میں۔ کلامِ خدا اور رسول کے علاوہ ہر کلام میں سہو و خطا ممکن لہٰذا ہر کلامِ غیرِ خدا اور رسول سے اختلاف ممکن۔ دراصل اصولوں کو نہیں بدلا جا سکتا۔

ربانی علما دینِ اسلام کے نمائندے ہوتے ہیں، اعلی حضرت بھی تھے۔ مگر یہاں پر کئی نکتے ہیں۔ رسول اللہ کی حدیث ہے کہ میرے صحابہ نجومِ ہدایت ہیں، مگر اِس کے باوجود کوئی ایک صحابی کُل دین نہیں، نہ حدیث کا یہ مطلب، بلکہ صحابی کی متابعت داخلِ کُل دین ہے۔ حضرت ابوذر غفاری جو مرتبے میں کم تھے، بایں ہمہ خلیفۂ راشد حضرت عمر کو دنیا دار کہتے تھے۔ ایک موقع پر رسول اللہ کے ایک ہی فرمان سے اجتہاد کر کے بعض صحابہ نے کچھ عمل کیا، بعض نے کچھ۔ رسول اللہ کی معراج جسمانی تھی یا محض روحانی، اِس میں دو بڑے موقف سبھی کو معلوم ہیں۔ غرض صحابۂ کرام کے درمیان درجنوں بڑے مسائل میں اجتہادات مختلف رہے۔

حدیث کا مطلب یہ ہے کہ کسی بھی صحابی کی اتباع نا قابلِ مواخذہ اور باعثِ ثواب ہے۔ یہ قطعی ہے کہ کسی چیز کا نا قابلِ مواخذہ ہونا الگ بات ہے اور اصل حق ہونا الگ بات۔ اِسی انداز پر ہم مذاہبِ اربعہ کی درستی کی تاویل کرتے ہیں۔ دینِ اسلام اِن سب پر حاوی ہے۔ اعلی حضرت کی مساعیِ تجدید و اِحیاے دین و سنیت قابلِ تحسین مگر حق صرف تحقیقاتِ رضا میں منحصر نہیں۔ ایسا سوچنا حق کی توہین ہے۔ ہاں تحقیقاتِ رضا حق کا حصہ ہیں۔ اعلی حضرت نے اپنے دور میں دوسروں سے اختلافات کیے، دوسروں نے اعلی حضرت سے۔ تو جو اعلی حضرت اور دیگر حضراتِ اہل سنت کے اتفاقات و اختلافات سب کو حاوی ہے وہ دینِ اسلام یا مسلکِ اہلِ سنت و جماعت ہے۔ بایں طور ہی

ہمارے نزدیک مسلکِ اعلی حضرت اُس کا مترادف ہے۔

مسلکِ اعلیٰ حضرت کی توضیح

مسلکِ اعلی حضرت ہی حق ہے، یہ نعرہ مبہم ہے جب تک یہ صاف نہ ہو کہ اِس سے مراد کیا ہے۔ مسلکِ اہلِ سنت مراد ہے تو یقیناً یہی حق ہے، جو خلاف ہے گم راہی ہے۔ مگر اُس وقت مسلکِ اعلی حضرت وہ ہوگا جس پر ہمیشہ جمہورِ مسلمین چلتے آئے ہیں نیز عہدِ اعلی حضرت میں جو تحقیقاتِ اعلی حضرت، دیگر اہلِ سنن کے خلاف اور تحقیقاتِ سُنّیانِ دیگراں، اعلی حضرت کے خلاف رہیں، اُن سب پر مشتمل ہو۔ ندرتوں کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ لیکن مراد مسلکِ اعلی حضرت سے تحقیقاتِ رضا یا موافقِ تحقیقاتِ رضا ہے بس۔ تو درست صرف یہ کہنا ہوگا کہ مسلکِ اعلی حضرت بھی حق ہے۔ جو خلاف ہے، اُس کا گم راہی ہونا ضروری نہ ہوگا۔ یاد رہے اہلِ سنت سے مراد صرف شمالی ہند کے سنی یا حضراتِ حلقۂ بریلی نہیں، نہ صرف ہند یا برصغیر ہند و پاک کے سنی یا بریلوی مراد ہیں، بلکہ دنیا بھر میں پھیلے حضراتِ اہل سنت مراد ہیں۔

مسلک کے لیے نئی اصطلاح کی ضرورت نہیں

ہم مسلکِ اعلی حضرت کی اصطلاح پر بھی قدرے گفتگو کریں گے۔ غالباً یہ اصطلاح وقتی ضرورت کے احساس کی ایجاد تھی، بعض گم راہ نظریات سے مختصر لفظوں میں امتیاز کے لیے ایسا کیا گیا، بزرگوں کا مبنی برخلوص اجتہاد، باعثِ ثواب رہا۔ مگر ہماری نظر میں ایک عالمی اصطلاح سے ہٹنا مناسب نہیں تھا، یہ اصطلاح یعنی مسلکِ اہل سنت آج بھی عالمی ہے، جب کہ مسلکِ اعلی حضرت محدودِ ہند و پاک، مرغوبِ بعضِ عاشقانِ رضا۔ نیز گھر میں کوئی غیر مستحق اجنبی گھس آئے تو، بہ جبر اُسے نکالا جاتا ہے، بخوشی خود نہیں نکلا جاتا کہ چلو ہم اپنا گھر دوسرا بنالیں گے۔

دوسری مثال سے یوں سمجھیے۔ فرض کرو کوئی خاص شے خاص نام اور خاص لوگو (logo) کے ساتھ بازار میں بکتی ہے۔ نہایت متعارف ہے، لوگ اُس کے نام اور لوگو (logo) پر آنکھ بند کر کے اعتماد کرتے ہیں، اُس کی purity یا originality پر ذرا شک نہیں کرتے۔ بعد میں کسی نے اُس نام سے نقل بنالی، تو اصول یہی ہے کہ اُس نقل کا نام بدلوایا جائے۔ اصل کا نام بدل کر چاہے آپ نئے نام، نئے لوگو، یا شے کی برقرار purity یا originality کا جتنا اشتہار کر لیجیے، اُس پر سے لوگوں کا اعتماد کم ہوگا۔ دوسری طرف لوگوں کی ایک بڑی تعداد ہمیشہ نقل کو اصل سمجھ کر خریدتی رہے گی چاہے اُس کے خلاف جتنا پروپیگنڈہ کر لیا جائے۔

ہر موقع پر یہ وضاحتی التزام کہ مسلکِ اہلِ سنت ہی کا دوسرا نام مسلکِ اعلی حضرت ہے، زائد تکلف ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے صرف اُردو کو بلا تکلف سمجھنے والوں کے سامنے اُردو میں تقریر کی کامل استطاعت رکھنے کے باوجود اولاً عربی یا انگریزی میں تقریر کا تکلف کیا جائے اور اُس کے بعد اُس کا ترجمہ۔ یہ سیدھی سادی پبلک کو قدرے چکر میں ڈالنے جیسا ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ جتنی جلدی لوگ اسلام کے نام پر کسی چیز کو قبول کر لیں گے، مسلک یا مسلکِ اہلِ سنت کے نام پر نہیں کریں گے اور جتنی جلدی لوگ مسلکِ اہلِ سنت کے نام پر کسی چیز کو قبول کر لیں گے، مسلکِ اعلی حضرت کے نام پر نہیں کریں گے۔ اب یہ ہمیں طے کرنا ہے کہ ہمارا مقصد فی الواقع عقائدِ مسلکِ اعلی حضرت کی تبلیغ ہے یا لفظِ ''مسلکِ اعلی حضرت'' کی تشہیر۔

عظمتِ رضا کو عالمی بنانا چیلنج

ذہن میں رہے کہ حق کی طاقت کے ساتھ مختصر جتھہ بنالینا کمال نہیں کیوں کہ ہزار منفی پروپیگنڈوں کے باوجود اتنا کام کسی کا اضافی احسان لیے بغیر بنفس نفیس سچائی اپنے دم پر کر سکتی ہے۔ اعلی حضرت کا زیادہ سے زیادہ تعارف کرانے کے دعوے دار یہ کام بند کر دیں تب بھی دنیا میں لوگوں کا ایک معتد بہ گروپ اعلی حضرت کے تذکرے کرتا رہے گا۔ دنیا علمیت اور سچائی کو کہاں ڈالے گی۔ علمیت اور اجتہادی کارناموں کے باعث ہی عصری اداروں نے آپ پر ریسرچ شروع کی ہے۔ یہ ادارے بارہ ہاتھ لمبی زبان رکھنے والے بے بصیرت مقرروں کی فالتو دہاڑوں اور بے ہنگم بھیڑ کے کان پھوڑ نعروں سے متاثر نہیں، اعلی حضرت کی علمی عبقریت سے متاثر ہیں۔ غرض آج اعلی حضرت کی مستحق علمی و دینی عظمت کو عالمی بنانا چیلنج ہے، اُسے ہندوستان میں شمالیا دینا، یا ہند و بیرونِ ہند بکھرے عموماً ہندی و پا کی معتقدوں کی رعایت سے مختصراً جتھیا دینا نہیں۔

کاش ہم غیروں کو نئی اصطلاح پر مجبور کرتے

فرقۂ ضالہ سے امتیاز کے لیے اِس اصطلاح کی ضرورت پر عرض ہے کہ ہم نے شروع ہی سے یہ ضد کیوں نہیں پکڑی کہ مسلکِ اہلِ سنت پر ہم گام زن ہیں، دیوبندی وہابی نہیں۔ ہم نے جس

طرح ہر فردِ گروہِ ضالہ کے لیے لفظ ’’وہابی‘‘ کی تشہیر کی، اِس طرح گروہِ ضالہ کے افکار ونظریات کے لیے ’’وہابی مسلک‘‘ کی تشہیر کیوں نہیں کی۔ جس کا نتیجہ ہوتا کہ جس طرح آج سماج میں ’’وہابی‘‘ لفظ بدنام ہے، اِسی طرح ’’وہابی مسلک‘‘ متعارف بھی ہوتا، بدنام بھی۔ لوگ اُسے سنی مسلک سے ہٹ کر ایک نیا اور غلط مسلک خیال کر کے اُس سے خود بہ خود کنارہ کش رہنے کی کوشش کرتے۔ یہ بات اصولی بھی ہے کہ جس کے نظریات نئے، اُس کی اصطلاح بھی نئی۔ جب کہ ہو یہ گیا کہ اغیار نے اپنا مسلک اہل سنت بتایا، اِس کے برعکس ہم نے اپنے کو بریلوی اور اپنے مسلک کو بریلوی مسلک یا مسلکِ اعلی حضرت بتایا۔ موقع شناس غیروں نے اِن جدید و ناما موس ناموں سے ہمیں مزید مشتہر کیا۔ ناچیز کے خیال میں فروغِ سنیت و ردِ وہابیت کی تحریک کے چلتے یہ عنوانی تبدیلی بھی قدرے سدِ راہ بنی ہے۔

کم از کم یہی ہوتا کہ ہمارے ساتھ دیگر لوگ بھی عالمی مورچہ چھوڑتے، ایک طرف ’’مسلکِ اعلی حضرت‘‘ متعارف ہوتا، دوسری طرف ’’مسلکِ اسماعیل دہلوی‘‘ یا ’’مسلکِ اشرف علی تھانوی‘‘۔ دونئ اصطلاحیں الگ الگ ناموں سے متعارف ہوتیں جس طرح کبھی مسلک الشیعہ کے ساتھ مسلک السنہ رائج ہوا۔ اِس صورت میں بہت سے بے راہ رو افراد، نظریاتِ مسلکِ جدید سے اتفاق کے باوجود مسلک کی اصطلاحِ جدید کے استعمال سے کنارہ کش رہتے جب کہ عام مسلمان کچھ سنے سمجھے بغیر یہ کہہ کر اُس سے بچتے کہ ہم سنی مسلمان ہیں، اِس نئے مسلک کو نہ ہم جانتے ہیں، نہ مانتے ہیں۔ جس کے بعد علَم بردارانِ مسلکِ جدید اپنی علمی وقلمی اور تحریکی سرگرمیوں کا ایک بڑا حصہ اِس بے سود کام کی ترویج میں صرف کرتے، آپس میں لڑتے جھگڑتے بھی۔ نتیجتاً وہ اصل عقائدِ فاسدہ کی ترویج کے لیے مطلوبہ فرصت نہیں پاتے، آپس میں دست وگریباں جو رہتے۔ جب کہ ہم لفظی تنازع میں نہ پڑ کر اصل عقائد وایمانیات جو اصل سنیت ہے، کے فروغ میں اپنی توانائیاں صرف کرتے۔ مگر افسوس کہ یہ سب چیزیں اُن کی نہیں، ہماری قسمت کا حصہ بن گئیں۔

مسلکِ اعلیٰ حضرت کی اصطلاح پر خطِ نسخ کھینچنا ضروری

ذوقِ زمانہ کے پیشِ نظر اور تحفظ وترقیِ مسلکِ اہل سنت کی خاطر ہماری آج بھی یہ قطعی رائے ہے کہ اصطلاحِ مسلکِ اعلی حضرت کی بدعت جس طرح کبھی حقِ اجتہاد استعمال کر کے ایجاد کی گئی تھی، اگر چہ خاص الخاص سنی بریلوی جلسوں میں آج بھی استعمال کی جاسکتی ہے، تاہم آج عام جلسوں، کانفرنسوں اور بالخصوص کسی طرح کی کتابوں، رسالوں، اخباروں وغیرہ میں اِس کا استعمال

اُسی حقِ اجتہاد کا استعمال کر کے یک سر موقوف کر دینا چاہیے۔ یہ اصطلاح اگر چہ ہمارے اکابر نے ایجاد کی مگر آج کے حالات کے ساتھ ہم زندگی گزار رہے ہیں، براہِ راست حالات سے نبرد آزما ہیں، لوگوں کے مزاج کو دیکھ رہے ہیں۔ اکابرِ سلف کے برخلاف ہم ہی اِس تعلق سے فیصلہ لینے کے مکلف بھی ہیں۔ یہ مسئلہ خالص علمی نہیں، نہ بایں طور دینی ہے کہ عنداللہ بالذات مطلوب ہے۔ محض تبلیغی حکمتِ عملی کا حصہ ہے۔ تبلیغی حکمتِ عملی میں مناسب تبدیلی حالات کی رعایت سے کسی بھی وقت ہر داعی ومبلغ کر سکتا ہے۔ یہی ہمارے اکابرِ سلف نے کیا۔ کہ ضرورت کے احساس کے تحت ایک جدید اصطلاح ایجاد کی۔ یہ وضعِ جدید، تبلیغی حکمتِ عملی میں تبدیلی ہی تو تھی۔

ترکِ اصطلاح کا ہمارا یہ فیصلہ اکابرِ سلف کی مخالفت نہیں۔ ورنہ لازم آئے گا کہ مسلک کی اصطلاحِ جدید وضع کر کے عہدِ قریب کے ہمارے اکابرِ سلف نے اپنے عہدِ قریب وبعید کے اکابرِ سلف کی مخالفت کی۔ بلکہ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اکابرِ سلف کی اصل سنت یہی ہے کہ حالات کی رعایت سے حکمتِ عملی میں تبدیلی لائی جائے۔ پس ذوقِ زمانہ کے لحاظ سے ضروری اصطلاحات کا وضع وترک سنتِ اکابرِ سلف کا حصہ اور اُن کے فکر وعمل کی پیروی ہے نہ کہ اُن کی مخالفت اور اُن سے دشمنی۔ حکمتِ عملی میں تبدیلی کی نظیر صحابۂ کرام کے اِس طرزِ عمل سے بھی ملتی ہے کہ رسول اللہ نے اپنی حیاتِ ظاہری میں عورتوں کو مسجد میں آکر مردوں کے پیچھے باجماعت نمازِ پنج گانہ ادا کرنے کی اجازت دی مگر خلیفۂ دوم حضرت عمر نے اپنے عہدِ خلافت میں اُنہیں مسجد آنے سے روک دیا جس کی تائید حضرت عائشہ نے بھی کی۔

مسلکِ اہلِ سنت ہی امتیاز کے لیے کافی

غرض مسلکِ اعلی حضرت کی اصطلاح کو جہاں اِس لیے لازماً ترک کر دینا چاہیے کہ یہ زمانۂ ماضی کے برخلاف زمانۂ حاضر کے علمی ودینی ذوق کے مطابق نہیں، سننے والے بدکتے ہیں۔ مزید آج یہ عام سطح پر بین اہل سنت باعثِ انتشار ہے، جب کہ بعض لوگ اِس لفظی اصطلاح کا غلط سہارا لے کر خاص بریلوی اہلِ سنت ہی کو خارجِ سنیت کر رہے ہیں۔ وہیں جب ہمارے رسول اللہ نے قیامت تک جنم لینے والے تمام بہتر (72) ضال فرقوں کے امتیاز کے لیے مسلکِ حق کا نام ’’مسلکِ اہل سنت و جماعت‘‘ (ملخصاً) تجویز فرما دیا تو ہمیں قیامت تک مزید کسی نئے نام کی ضرورت نہیں۔

سیدھی بات ہے قیامت تک بہتر (72) سے زیادہ فرقے نہیں، نتیجتاً اُن سب سے امتیاز اور مقابلے کے لیے قیامت تک نبوی اصطلاح ’’مسلکِ اہل سنت و جماعت‘‘ سے ہٹ کر کسی نئے

اصطلاح کی اصلاً ضرورت نہیں۔ دوسری اصطلاح اتنی بافیض بھی ثابت نہیں ہوسکتی جتنی نبوی اصطلاح، نہ اُتنی موثر وکارگر ثابت ہوسکتی ہے۔ اِس سوال کے جواب میں کہ آپ کون سے سنی ہیں، کس سنی مسلک کو مانتے ہیں، دیوبند والے یا بریلی والے، دوٹوک کہا جائے کہ سنی مسلک یا مسلکِ اہلِ سنت صرف ایک ہے اور قیامت تک ایک ہی رہے گا، یہ صحیح ترین اسلام ہے جو غیر مبتدل ہے۔ رہا دیوبند و بریلی تو بریلوی کوئی مسلک نہیں، اعلی حضرت کے ماننے والے اہلِ سنت ہیں، جب کہ علماے دیوبند خارج از مسلکِ اہلِ سنت اور اُن کا مسلک وہابی۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ حق کو تقسیم نہ کیا جائے، نہ چودہ سو سال سے متجاوز عرصے کی طاقت ور اصطلاح کو بے معنی کیا جائے۔

نئی اصطلاح کے پس پردہ دفاعی احساس

تقصیر معاف! لگتا ہے، مسلکِ اعلی حضرت کی اصطلاح کے پس پردہ خود کو دفاعی پوزیشن میں سمجھنے کی غلط فہمی کارفرما رہی۔ غالباً یہی غلط فہمی آج بھی کام کر رہی ہے۔ دفاعی احساس کا اِس سے بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ عموماً ہمارے جلسے 'تحفظِ سنیت' کے نام پر ہوتے ہیں، 'فروغِ سنیت' کے نام پر نہیں ہوتے۔ گویا ہم نے مان لیا ہے کہ سنیت پھیلانا مشکل ہے، جتنی بچ سکے بچالو۔ یہ احساسِ کم تری ہی کی دین ہے۔ یہی ڈر ترویجِ فکرِ اعلی حضرت کے ساتھ قائم ہے۔ یعنی تحفظ کے نام جلسے ہوتے ہیں، فروغ کے نام پر نہیں۔ دفاعی پوزیشن میں ہونے کے ہمارے احساس سے دیگر مسالک کے لوگوں کو کوئی نقصان نہیں، اُن کا مقصد (لفظاً) مسلکِ اہلِ سنت پر قبضہ جمانا تھا جو بہت حد تک ہندوپاک میں حاصل ہوگیا۔ رہی اصطلاحِ مسلکِ اعلی حضرت، تو اُنھیں اِس کی ضرورت نہیں، زبردستی بھی کوئی دے تو وہ نہیں لیں گے۔ ایسی صورت میں ہمارا اُن سے چیلنج بھی ختم ہوگیا۔ یہ چیلنج ہم نے اُنھیں شکست دے کر ختم نہیں کیا بلکہ اُن سے شکست کھا کر ختم کیا۔

مسلکِ اہلِ سنت کی اصطلاح پر صرف ہمارا حق

لیکن سوال یہ ہے کہ ہم مثلاً ہندوؤں، بُدھسٹوں، جَینیوں وغیرہ کو اسلام کی اصطلاح کیوں استعمال کرنے دیں۔ اسلام کی اصطلاح ہمارے رب کی دی ہوئی ہے جس پر صرف ہمارا یعنی مسلمانوں کا حق ہے۔ اِسی طرح مسلکِ اہلِ سنت کی اصطلاح ہمارے رسول کی دی ہوئی ہے جس پر صرف اہلِ سنت و جماعت کا حق ہے۔ مسلکِ اہلِ سنت کی اصطلاح ہماری چودہ سو سالہ امتیازی ایمانی

وراثت ہے، ہم اِس سے تاحشر دست بردار نہیں ہوسکتے۔ نہ وہابیوں کا اُس کا رسمی و روائتی استعمال ہمیں قبول۔ علماے حق تیرہویں صدی ہجری تک اِسی پر ڈٹے بھی رہے جب کہ اِس لمبے عرصے میں نہ جانے کتنے ضال فرقے وجود میں آئے اور غرقِ عدم ہوئے۔ حدودِ ممالک سے ماورا، ایک اندازے کے مطابق ستّر فی صد علماے حق آج بھی اِسی موقفِ حق پر قائم ہیں۔

مسلکِ اعلی حضرت کی اصطلاح کی بہت معمولی سی گنجائش شاید اُس وقت نکل پاتی کہ گلوبلائزیشن کے اِس دور میں مسلمانوں کے درمیان یہ عالمی سطح پر قبول کر لی جاتی۔ تب یہ عذر ہوسکتا تھا کہ چلو اتنی بڑی سطح پر رائج اصطلاح کو کلیتاً منسوخ کرنے میں لوگوں کے درمیان غیر ضروری اضطراب اور بے چینی پیدا ہوگی۔ جب کہ یہاں حالات یہ ہیں کہ اِس کے لیے روزِ اول سے آج تک ہم مٹھی بھر لوگ ہی چھپر چڑھا رہے ہیں۔ عام مسلمان یا یوں کہیے کہ عوام وخواصِ اہل سنت وہ بھی ہندوپاک کی حد تک، اِس کی ضرورت وافادیت پر نہ کل متفق ہو پائے، نہ آج متفق ہیں۔ تازہ حالات مزید عبرت ناک ہیں۔

دنیاے اسلام قادیانیوں کو یہ اجازت نہیں دینا چاہتی کہ وہ اپنے مذہبی نظریات کے لیے اسلام کا لفظ استعمال کریں۔ ایران میں بھی یہ سخت فیصلہ لیا گیا تھا جب کہ پاکستان میں آج بھی اِس تعلق سے پارلیمنٹ سے قانون پاس ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ دنیا جس کی تکفیر کر رہی ہے اُسے اسلام تک کے استعمال کی اجازت نہیں دے رہی ہے۔ جب کہ ہم جسے کافر سمجھ رہے ہیں اُسے مسلکِ اہلِ سنت تک کے استعمال کی اجازت دے رہے ہیں۔ بلکہ وضاحت اور امتیاز کا سہارا لے کر خود اپنے ہی لیے دوسری اصطلاح وضع کر لے رہے ہیں۔ مسلکِ اعلی حضرت کی اصطلاح سے مسلکِ حق خوب روشن اور ممتاز ہوجاتا ہے، پر عرض ہے کہ ''کفر'' سے امتیاز کے لیے ''اسلام'' کافی اور بدمذہبی سے امتیاز کے لیے ''مسلکِ اہلِ سنت'' کافی۔ بحیثیتِ دال بھی بحیثیتِ مدلول بھی۔

مسلکِ اعلیٰ حضرت کے مصداق میں مسلسل تضئیق

مسلکِ اعلی حضرت سے کیا ممتاز ہوتا ہے۔ زیادہ انصاف یہ ہے کہ ہندوپاک میں پھیلے حضراتِ اہلِ سنت میں سے ''حلقۂ بریلی'' ممتاز ہوتا ہے۔ تازہ حالات میں شاید یہ بھی نہیں۔ کچھ لوگ دعوتِ اسلامی، سنی دعوتِ اسلامی، کچھوچھہ، بدایوں، اشرفیہ، مصباحیانِ اشرفیہ، خانقاہِ شرافتیہ بریلی، خانقاہِ عارفیہ الہٰ آباد وغیرہ کو مخالفِ مسلکِ اعلی حضرت کہنے لگے ہیں۔ خانقاہِ مارہرہ کو غیر محتاط

تصور کرنے لگے ہیں۔ ہم سے عصرِ حاضر کے ایک حشمتی المزاج عالم نے کہا کہ موجودہ دور میں جو حشمتی ہے وہی مسلکِ اعلی حضرت کا سچا ماننے والا ہے۔ لہذا معترضین کی مانیں تو حالیہ صورت میں مذکورہ سنی تنظیمیں، ادارے، خانقاہیں مخالفِ مسلکِ اعلی حضرت ہیں۔ پس بہ اعتبارِ حالاتِ تازہ، مسلکِ اعلی حضرت سے حلقۂ بریلی کی بھی نہایت مختصرترین اور بچی کھچی ٹولی کا فکری ذوق یا فقہی نقطۂ نظر ہی خوب ممتاز اور روشن ہوتا ہے۔ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے اکابرِ سلف نے حلقہ جاتی سطح پر مسلکِ اعلی حضرت کی اصطلاح، مسلکِ اہلِ سنت کے مترادف کی صورت میں وضع کی۔ جو تطبیقی ومصداقی مرحلے میں روزِ اول ہی سے تقریباً حلقۂ بریلی کا نشانِ امتیاز ہوکر رہ گئی۔ آج حالات نے پھر کروٹ لی۔ اب اِس سے حلقۂ بریلی کے طبقاتِ عدیدہ میں سے بھی صرف مٹھی بھر، اَفراد پر مشتمل ایک ’’دھڑا‘‘ مراد ہے۔ نتیجے کے طور پر عہدِ اکابرِ سلف کے بعد اصطلاحِ مسلکِ اعلی حضرت مسلسل محدود المصداق ہوتی جا رہی ہے۔

بدمذہبوں سے امتیاز کی ضرورت کے احساس پر مزید عرض ہے کہ حق لفظوں سے نہیں مدلولات سے ممتاز ہوتا ہے۔ لفظوں کا جدید مسلک بنا کر اُسے ممتاز کرنے کی ضرورت نہیں۔ مستحکم قرآنی وحدیثی دلائل کی رو سے حق کو ممتاز وواضح کرنے بلکہ رکھنے کی ضرورت ہے۔ حق کے وہ دن نہیں آئے ہیں کہ وہ دنیا میں نام بدل بدل کر جیے۔ ایک عنوان کی پناہ لے، باطل اُسے چھین لے، دوسرے عنوان کی پناہ لے، باطل اُسے بھی چھین لے۔ ہمیں تسلیم نہیں۔ دوٹوک عرض ہے کہ جب تک ہمارے پاس اسلام کو اسلام کے نام سے اور مسلکِ اہلِ سنت کو مسلکِ اہلِ سنت کے نام سے ثابت وواضح کر سکنے کی طاقتِ علمی ہے، اُس وقت تک ہم کسی دوسری اصطلاحِ مبتدعہ کو بالخصوص معیارِ کفر واسلام یا معیارِ سنیت وغیر سنیت کی شکل میں قبول نہیں کر سکتے۔ عاجزین جو چاہیں کریں۔

لفظِ مسلکِ اعلیٰ حضرت کی نہیں۔ فروغِ دینِ حقیقی کی ضرورت

حضراتِ اہلِ سنت میں سے جو لوگ اللہ اور اُس کے رسول کے دینِ حقیقی اور سنیتِ قطعی کے زیادہ سے زیادہ فروغ کے لیے مخلص و دردمند ہیں، اُنہیں لفظوں کی تشہیر کی جگہ حقائق کی ترویج پر اپنی طاقتِ علم وفکر اور قوتِ زبان وقلم صرف کرنا چاہیے۔ غور کیجیے، ہم مختصر لوگ مسلکِ اعلی حضرت کا نعرہ لگاتے رہیں، جس سے اختلاف کر کے بعض سنی حلقے ہم سے کنارہ کشی اختیار کر لیں، جن کے ساتھ اتحاد اور باہمی صلاح ومشورے سے فروغِ سنیت کی مزید بہتر کاوشیں کی جا سکتی تھیں وہ بھی بند ہو جائیں،

مزید یہ کہ عام مسلمان ہماری سننے کے بجائے مسلکِ اعلی حضرت کے نام پر بدکنے لگیں، جب کہ اغیار اِس اصطلاحِ جدید کے سہارے لوگوں کے درمیان ہمارے خلاف جم کر گمراہ کن پروپیگنڈہ کریں اور اِن سب کے نتیجے میں فروغِ سنیتِ حقہ میں رکاوٹیں پیدا ہوں، تو ایسی رکاوٹ جس کو دور کر دینے میں دین وسنیت کا کوئی نقصان نہیں، دور ہی کر دی جانی چاہیے۔

یہ بے توفیق جہالت تو شرعاً واجب الترک ہے کہ جس نے مسلکِ اعلی حضرت کا نعرہ نہ لگایا، یا زمانے کے مقتضیات دیکھ کر اِس طرح کے نعروں پر پابندی لگا دی، اُسے کہا جائے کہ وہ سنی نہیں رہا، یا وہ اعلی حضرت سے دشمنی رکھتا ہے، یا وہ صلح کلی ہے وغیرہ۔ یہ جہالت، شرع پر بڑی جرأت ہے۔ کتنی ناسمجھی کی بات ہے کہ جب اصطلاحِ مسلکِ اعلی حضرت کو کلیتاً متروک یا محدود الاستعمال کرنے کی بات کی جاتی ہے تو بجائے کوئی معقول بات کرنے کے کچھ لوگ اصطلاح کے لغوی معنی اور اُس کے نفس الامری جواز پر دلائل دینے لگتے ہیں یا مخالفِ اعلی حضرت ومخالفِ نظریاتِ مسلکِ اعلی حضرت ٹھہرانے لگتے ہیں۔ وہ یہ نہیں سوچتے کہ دوسرا آدمی کہہ کیا رہا ہے۔ خلطِ مبحث کرنے لگتے ہیں۔

ہم تو کہتے ہیں کہ آپ مسلکِ اعلی حضرت کی اصطلاح بھی چھوڑیے۔ آپ کو لگ رہا ہے کہ بہت سے لوگ مسلکِ اعلی حضرت پر نہیں چل رہے ہیں، مگر دعوی کر رہے ہیں، لہذا یہ اصطلاح بھی معیار نہ رہی۔ آپ ’’مسلکِ اعلی حضرت جدید‘‘ وضع کر لیجیے یا ذوق کے لحاظ سے ’’مسلکِ ٹاٹن سنی‘‘ یا ’’مسلکِ خوں خوار سنی‘‘ نکال لیجیے، ہمیں اِس کے نفس الامری جواز پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ بلکہ اِن اصطلاحوں سے مراد دینِ اسلام ہے تو اِن پر ہمارا ایمان ہوگا۔ ہمیں صرف غیر ضروری اصطلاحاتِ مبتدعہ کے استعمال سے عوام پر پڑ رہے غلط اثر پر تشویش ہے۔ مسلکِ اعلی حضرت جو بشرطِ توجیہِ صحیح ہمارا دین وایمان ہے، ہمیں اُس سے بلفظِ دیگر اپنے ایمان سے حسد کیوں ہوگا۔ ہم فی زمانہ اصطلاحِ جدید کے عام استعمال سے سنیت پر پڑ رہے محدود کن اثرات دیکھ کر اُس کے عام استعمال پر شکوہ کناں ہیں۔

اختلافی مسائل کے حل کے لیے بورڈ بنالیں

آج کہا جاتا ہے کہ کچھ لوگ اعلی حضرت سے اختلاف کر رہے ہیں، رضویت سے ہٹ رہے ہیں وغیرہ۔ اِس پر اولاً تو یہی عرض ہے کہ دینی اساس کے اعتبار سے اِس کا کوئی مطلب نہیں۔ ثانیاً بہتر ہے کہ پروپیگنڈوں سے باز آئیں۔ چینی کہاوت ہے کہ ’’تھوڑے لوگوں کو بہت دنوں تک

اور بہت لوگوں کو تھوڑے دنوں تک بے وقوف بنایا جا سکتا ہے لیکن بہت لوگوں کو بہت دنوں تک بے وقوف نہیں بنایا جا سکتا''۔ لہذا تخریب کاری چھوڑ کر جو کام کرنے کا ہے وہ کریں۔ کوئی بورڈ ایسا تشکیل دیں جو صرف اختلافی مسائل کی علمی و شرعی حیثیت طے کرے۔ جس کے ارکان تمام کبارِ علماے اہل سنت ہندوستان ہوں۔ اِس بورڈ کے اپنے واضح منصفانہ ضابطے اور اصول ہوں۔ بورڈ میں نہ کوئی بڑا ہو نہ کوئی چھوٹا، ہر ایک کی علمی راے برابر اہم قرار دی جائے۔ سرپرست و صدر کوئی نہ ہو، ہو تو اُنہیں علمی راے دہی کا حق نہ ہو۔ یہ بورڈ صرف اختلافی مسائل کو طے کرنے کے لیے وجود میں لایا جائے بس۔

بورڈ ہر اختلافی مسئلے کی تین میں سے کوئی ایک پوزیشن طے کرے: (1) پیشِ نظر مسئلہ اعلی حضرت سے اختلاف پر مبنی ہے، یا نہیں۔ (2) اختلاف کے باوجود آج کے حالات میں یہ مسئلہ ایسے ہی ہونا چاہیے یا نہیں۔ (3) کل ملا کر تحقیقِ جدید قابلِ احترام ہے یا نہیں۔ کچھ ایسا ہو کہ دو تہائی اکثریت صورتِ اول کے لیے، سادہ اکثریت صورتِ ثانی کے لیے اور ایک تہائی تعداد صورتِ ثالث کے لیے ضروری سمجھی جائے۔ جب کہ آج خود بہ خود جو فیصلے کیے جا رہے ہیں کہ یہ اعلی حضرت کے خلاف ہے، یہ صلح کلیت ہے وغیرہ، یہ فیصلہ کاروں کے دائرۂ اختیار سے باہر کے فیصلے ہیں۔ اِسی لیے بے وزن بھی ہیں، انتشار انگیز بھی۔ اعلی حضرت سے اختلاف کیا ہے، کیا نہیں یا مثلاً رضویت کیا ہے، کیا نہیں، یہ صرف چند علما طے نہیں کر سکتے کیوں کہ وہ رضوی بریلوی علما کے کئی طبقوں میں سے صرف ایک طبقہ ہیں، کل نہیں۔ اِس سلسلے میں اُن کے یک طرفہ فیصلے ایک یا چند افراد کی ذاتی آرا ہو سکتی ہیں، اِس سے زیادہ نہیں۔ موجودہ صورت میں عام بریلوی سنیوں کو اختیار ہے کہ وہ دو علمی و اجتہادی موقفوں میں سے جس پر چاہیں عمل کریں۔ ہاں احترام بیک وقت دونوں علمی موقفوں کا کریں۔ دینی سوچ یہی ہے۔ یہی اصل مسلکِ حق پر عمل ہے۔ اِس کے خلاف گروپ بازی اور جتھہ پسندی ہے۔ دین و سنیت خالص نہیں۔ بلکہ دین و سنیت اِس شذوذ پسندی سے مجروح ہو رہی ہے۔

اعلیٰ حضرت کی تحقیق پر تحقیق نہ کی جائے۔ مردود ضابطہ

یہ سوچ کہ جس پر اعلی حضرت نے تحقیق فرما دی، اُس پر تحقیق نہ کی جائے، نہایت غیر علمی و غیر شرعی کلیہ ہے۔ ضابطہ ہونے کی حیثیت سے قابلِ تردید ہے۔ اعلی حضرت نے اَن گنت فتاوی لکھے، بے شمار تحقیقات کیں، تنقیحات رقم فرمائیں۔ اپنے زمانۂ مبارکہ میں دین و شریعت کی بڑی جامع نمائندگی کی، تو کیا اب لکھنا پڑھنا بند کر دیا جائے، اُردو سیکھ لی جائے، چھٹّی۔ فقہ میں اسبابِ ستہ

کی معنویت ختم کر دی جائے۔ شریعت کو جامد، بے بصیرت، حالات کی رعایت نہ رکھنے والی فرسودگی اور خالص دقیانوسیت ٹھہرا دیا جائے۔ غور کیجیے، یہی مطالبہ مجدد الف ثانی، شیخ عبدالحق دہلوی، شاہ ولی اللہ دہلوی کے سلسلے کے لوگ بھی کرتے۔ مزید پہلے چلیے امام غزالی، شیخ عبدالقادر جیلانی، امام جلال الدین سیوطی وغیرہ کے خاندانی یا معتقدینِ حلقہ یہ مطالبہ کرتے۔ شریعت ایک سلسلے یا گھر کی ہو کر رہ جاتی۔ خانہ جنگی کی آماج گاہ بن جاتی۔

کچھ لوگ یہی آواز اُٹھاتے کہ متحدہ ہندوستان کے کثیر علماے اہلِ سنت کی متفقہ فقہی تحقیق کا عطرِ سراپا فتاوی عالم گیری کے محقَّق مسائل پر تحقیقِ جدید نہ کی جائے، یا کم از کم برصغیر ہند و پاک میں نہ کی جائے۔ بلکہ پابندیوں کے یہ سلسلے اور پہلے مثلاً عہدِ صحابہ یا عہدِ تابعین یا عہدِ تبع تابعین سے شروع ہو جاتے۔ سیدھے یہ فیصلہ لیا جاتا کہ قرآن و حدیث کے متنوں کے علاوہ جو کچھ اب تک مفسرین و محدثین اور فقہا و مجتہدین نے علمی موشگافیاں کی ہیں وہ سب تلف کر دی جائیں۔ کیوں کہ اللہ اور اُس کے رسول کے اصل کلام کے ہوتے ہوئے تحقیقاتِ عام بندگان کی موجودگی فتنہ پرور اور انتشار کن ہے۔ لوگوں کے براہِ راست قرآن و حدیث سے جڑے جذبات مجروح ہو رہے ہیں۔

قابلِ غور ہے، اللہ نے قبلِ اسلام متعدد شریعتیں نازل کیں، جو یکے بعد دیگرے منسوخ ہوتی گئیں۔ اِس نزول و نسخ میں ازمنۂ مختلفہ کے اعتبار سے لوگوں کے طبائع کی رعایت ایک بڑی حکمت تھی۔ جب کہ اسلام قیامت تک کے لیے نازل کیا گیا ہے، آج اِسے نازل ہوئے چودھ سو سال سے متجاوز عرصہ گزر چکا ہے، قیامت کب آئے گی یہ اب بھی طے نہیں۔ اِس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ قطعی الاصول ہونے کے باوجود داخلی طور پر اسلام کس قدر چوڑا دل لے کر نازل ہوا ہے۔ شریعتِ الٰہیہ بیک وقت ایک مسئلے میں چار چار اختلافات برداشت کر رہی ہے، بلکہ بشرطِ خلوصِ نیت اِن اختلافات کو امت کے لیے زحمت نہیں، رحمت قرار دے رہی ہے۔ مذاہبِ اربعہ یہی تو ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ مذاہبِ اربعہ بندوں پر اللہ کی رحمت ہے۔ مگر ہم ہیں کہ اپنی ضد کے آگے سارے مراحلِ غور و فکر بھول بیٹھے ہیں۔ جو شریعتِ اسلامیہ کا گلا مسوسنا ہے۔

تحقیق پر تحقیق جاری رہے گی

ذہنی تعطل دیکھیے! کہاں بعدِ ائمۂ اربعہ شرعاً بابِ اجتہاد بند نہیں، کہاں بعدِ اعلی حضرت بابِ تحقیق بند ہے۔ معترضین یہ بھی نہیں سوچتے کہ جہاں بعض مستقل مسائل میں علمی اختلاف کی

گنجائش تحقیقِ جدید کی بنیاد پر ہو سکتی ہے، وہیں بہت سے مسائل براہِ راست وہ ہوتے ہیں جن پر اپنے زمانے اور حالات کے اعتبار سے علماے عصر ہی فیصلہ لے سکتے ہیں۔ مثلاً عہدِ رسالت میں عورتوں کو مسجد میں نماز باجماعت کی اجازت تھی مگر خلیفۂ دوم نے اپنے عہد میں اُنہیں روک دیا، بلکہ کئی مسائل میں جدید فتاوی جاری کیے۔ عہدِ رسالت وعہدِ خلافتِ بوبکر وعمر کے برخلاف خلیفۂ سوم حضرت عثمان نے جمعہ میں اذانِ ثانی کا اضافہ کر دیا۔ غور کیجیے، کہیں امرِ نافذ کو موقوف کیا گیا، کہیں معدوم کو موجود و نافذ۔ ہم سیدھے عہدِ اعلیٰ حضرت میں آ جائیں۔ اعلیٰ حضرت نے متعدد مسائل میں نئی تحقیقات کیں، بعض بڑے محققین سے اختلاف کیا۔ بعد میں آپ کے خلفا اور تلامذہ نے یہ سلسلہ جاری رکھا۔ یہ سلسلہ حسبِ روایت آج بھی جاری ہے۔ حضرت مفتی نظام الدین رضوی صدر شعبۂ افتا و پرنسپل جامعہ اشرفیہ مبارک پور نے اپنی ایک جدید تالیف میں اِس موضوع پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ یہ سب آپسی دشمنیوں یا مخالفتوں کا ثمرہ نہیں تھا۔ یہ شریعتِ رَحّابہ کے اجمالات کی تفصیلات ہیں جو بہ وقتِ ضرورت، بہ توفیقِ الٰہی علماے زمانہ کرتے رہتے ہیں۔ یہ سلسلہ تا قیامت جاری رہے گا۔

ذاتِ رضا سے منفی جذبات نہ جوڑیں

جہاں تک انتشار کی بات ہے تو ہمیں افسوس ہے کہ بعض معتقدینِ اعلیٰ حضرت نے اعلیٰ حضرت کی ذات سے مثبت کے بجاے ایسے منفی جذبات کیوں جوڑ لیے جس سے بجاے شرع پر عمل کے، ایک مسلّم دینی وشرعی قاعدے ہی پر خطِ تنسیخ کھنچتا ہے۔ دراصل انتشار کچھ نہیں۔ سچ یہ ہے کہ معترضین خود ہی گم راہ کن پروپیگنڈے پھیلاتے ہیں۔ اعلیٰ حضرت کا نام لے لے کر لوگوں کو غیر شرعی مخالفتِ شدیدہ پر آمادہ کرتے ہیں جیسا کہ ہر سال کی طرح اِس سال بریلی عرس میں ہوا۔ ممبئ میں بلا قیدِ موسم ہوتا رہتا ہے۔ جب ماحول خوب گرم ہو جاتا ہے تو آگ جلتی چھوڑ کر آ کے کہتے ہیں کہ دیکھو بھئی! ایسا مت کرو، اِس سے جماعت میں انتشار ہو رہا ہے۔ انتشار کا حیلہ کرنے والے بتائیں گے کہ اُنہوں نے کتنی جگہ لوگوں کو یہ بتایا کہ فقہی مسائل میں علمی اختلاف جائز بلکہ اُمتِ مسلمہ کے لیے رحمت ہے۔ یہ حدیثِ رسول سے ثابت ہے۔ حسبِ روایت اِس سال بھی بریلی میں انتشار انگیزی کی گئی، بد دعائیں دی گئیں۔ ارشادِ رسول نہیں بتایا گیا، قائدۂ شرعی نہیں سنایا گیا۔ افسوس! خود ہی حدیث چھُپاتے ہیں، ضابطۂ فقہ سے کتراتے ہیں، غیر شرعی انتشار انگیزی کرتے ہیں، پھر کہتے ہیں کہ انتشار ہو رہا ہے۔ حیف! اللہ دماغوں کے مکر وشرارت کو خلوص وللّٰہیت

سے بدل دے۔ خدا توفیق دے کہ یہ لوگ ذاتِ اعلیٰ حضرت سے منفی جذبات نہ جوڑیں۔

اختلاف کے لیے علمی برتری کی شرط کی توضیح

یہ نظریہ کہ اختلاف وہی کر سکتا ہے جو علم میں زیادہ یا کم از کم برابر ہو، واضح المراد نہیں۔ بادی النظر میں ہمیں یہ کئی جگہ ٹوٹتا نظر آتا ہے۔ مثلاً امام اعظم کے مقابلے ائمۂ ثلاثہ کو علم میں کسی قدر جونیئر مانا جائے تو اِس کے باوجود اُنہوں نے وضعِ قواعد میں اختلاف کیا۔ شاگردانِ امام اعظم نے امام کے ذریعے وضعِ قواعد کے بعد تفریعات میں امام سے اختلاف کیا حالاں کہ قواعد سازی کے بعد امام اپنے شاگردوں سے علم میں کم نہ ہوئے، نہ برابری پر منحط ہوئے بلکہ پہلے کی طرح زیادہ ہی رہے۔ نیچے اُتریے تو اعلیٰ حضرت ہی سے بعض معاصر علماے اہل سنت نے کئی مسئلوں میں اختلاف کیا، بعض علماے عرب نے اختلاف کیا، بعض علماے ہند خصوصاً علماے کچھوچھہ، فرنگی محل، بدایوں، رامپور، نے اختلاف کیا اور یہ سب علم میں مرتبۂ اعلیٰ حضرت سے بڑھ کر یا برابر ہی نہ تھے۔ بلکہ متعدد مسائل میں آپ سے آپ کے خلفا وتلامذہ نے اختلاف کیا۔ خود آج کے معترضین نے بعض مسائل میں اختلافات کیے ہیں۔ آج مجلس شرعی مبارک پور یا شرعی کونسل بریلی کے فقہی سمیناروں میں جونیئر اپنے سینئروں سے بلا جھجک اختلافات کرتے رہتے ہیں۔ صرف بحث ہی کے دوران نہیں بلکہ بسا اوقات سینئروں کی آخری وضاحتوں سے بھی مطمئن نہیں ہوتے، نتیجتاً اپنے فیصلے رجسٹر میں جُداگانہ درج کراتے ہیں۔

اختلاف نہ کرنے کا حکم اکثری ہے

زیادہ انصاف یہ ہے کہ اختلاف نہ کرنے کا حکم اکثری ہے، یعنی یہ کہ بیش تر مسائل تسلیم کیے جائیں۔ یہ فطری بھی ہے کیوں کہ کم علم شخصیت بیش تر مسائل میں جداگانہ تحقیقات کر ہی نہیں سکتی۔ یہ مطلب نہیں کہ ذرا بھی ہٹنا درست نہیں۔ یہ کلامِ خدا و رسول کی شان ہے جس سے سرِ مو اِنحراف جائز نہیں۔ حکمِ اکثری کی وضاحت کے بعد معترضین بتائیں کہ کس نے بیش تر مسائلِ فتاوی رضویہ کالعدم ٹھہرائے ہیں۔ ہزاروں تصانیفِ رضا بشمول فتاوی رضویہ کے لاکھوں مسائل میں سے ہزار مسائل میں اختلاف کر لیا جائے۔ تب صرف ایک فی صد بنتا ہے۔ یہاں حال یہ ہے کہ دو چار مسائل ہی ایسے ہیں جن میں فتاوی رضویہ ہی کے اصولوں کی روشنی میں عموماً تبدیلیِ حالات کی رعایت سے جدید آرا ظاہر کی گئی ہیں۔ یہ کل اختلافات اتنے بھی نہیں جتنے حلقۂ بریلی کے اکابرِ سلف کر چکے

ہیں جن میں خلفا و تلامذۂ اعلیٰ حضرت کے ساتھ موجودینِ بریلی تک شامل ہیں۔

اعلیٰ حضرت بشر تھے۔ مافوق البشر نہیں

لیکن اَعشاریہ میں بھی اختلاف برداشت نہیں تو عرض ہے کہ یا تو اعلیٰ حضرت ماورائے بشر ہیں کہ آپ سے خطا ممکن نہیں، یا اختلاف کرنے والے معصوم ملائکہ ہیں کہ صواب ہی پر قائم رہیں گے۔ رہی کم علمی، تو یقیناً اعلیٰ حضرت علم کے وہ جبلِ عظیم تھے جسے مختصراً عطیۂ خداوندی ہی سے تعبیر کر کے حقِ تعبیر ادا کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اِس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اب کے کسی عالمِ دین کا وجود اعشاریہ میں بھی قابلِ لحاظ نہیں بلکہ کسی مسئلے پر اتفاقِ رائے ظاہر کرنے والے سیکڑوں علما تک کی علمی و شرعی حیثیت محض سراب یا خالص عدم کا دُھندلکا ہے۔ اِسی پر اصرار ہے تب بھی مساوی حیثیت رکھنے والے قلیل التعداد معترض موجودین سے تو اِس مسئلے میں اختلاف کیا ہی جاسکتا ہے کہ اعلیٰ حضرت کی تحقیق پر تحقیق کی جاسکتی ہے۔ منعِ تحقیق بر تحقیقِ رضا، ضابطۂ رضا نہیں، ضابطۂ موجودین ہے۔ موجودین سے اختلاف ایک سراب کا دوسرے سراب سے ہو یا ایک عدم کا دوسرے عدم سے، یہ اختلاف بین المساوین ہی ہے جو معترضین کے حلق سے بھی اُتر جانا چاہیے۔ ضابطۂ یہی تو تھا کہ کم علم اختلاف نہیں کرسکتا۔

اختلاف کا مطلب دشمنی نہیں

اعلیٰ حضرت سے اختلاف کو مخالفت قرار دینا دوسری جسارت ہے۔ اِس ضابطے کا مطلب ہوگا کہ ائمۂ اربعہ بھی آپس میں دشمن قرار دیے جائیں۔ حضرت فاروقِ اعظم پر بھی یہی الزام عائد کیا جائے۔ آپ رسول اللہ سے علم میں بہت کم تھے، شاید اُس سے بھی کم جیسی ذرے کو آفتاب سے نسبت ہے۔ اِس کے باوجود آپ نے عہدِ رسالت کے برعکس فیصلہ لیا۔ بلکہ آج تک جتنے اکابرِ علمائے اہل سنت کی جداگانہ فقہی تحقیقات آئی ہیں اُن میں قدرے جونیئر اپنے سینئروں سے اختلاف کے بجائے اُن کی مخالفت کرنے والے اور اُن کے کام و نام سے حسد و کینہ رکھنے والے قرار پائیں۔ فقہ میں بعد والے امامِ اعظم کے دشمن ٹھہریں۔ سلاسلِ طریقت کے بانی مشائخ اور خلفا و مریدین آپس میں ایک دوسرے کے سلسلے اور شیوخِ سلسلہ کے مخالف قرار پائیں۔ علمِ کلام میں امام اشعری و امامِ ماتریدی ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ٹھہریں۔

اشتراکِ عمل کی مخالفت پر چند وضاحتیں مطلوب

دیوبندیوں وہابیوں سے بقدرِ ضرورت اتحاد و اشتراک کی مخالفت پر چند باتیں وضاحت طلب ہیں۔ (1) یہ تنقیح کی جائے کہ مخصوص علمائے دیوبند کو کافر نہ سمجھنے والے کو کافر نہ سمجھنے والے کو کافر نہ سمجھنے والے کو کافر نہ سمجھنے والے کو۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ھلم جراً علی ھذا القیاس، یہ سلسلۂ تکفیر کہاں جا کر رکے گا اور کیا اِس کے بعد دنیا یا ہندوستان میں مسلمان اُنگلیوں پر گنے جانے کے لیے لائق رہ سکتے ہیں۔ (2) مخصوص علمائے دیوبند کی تکفیر پر مبنی حُسام الحرمین پر تصدیقِ جدید کے ساتھ اِس کی تحقیقِ جدید کی جائے کہ آج کے جمیع دیوبندی حضرات بھی واقعی ختمِ نبوت کے منکر، توہینِ انبیا کے مرتکب نیز بعض دیگر بڑے نظریاتِ شنیعہ کے متحمل ہیں۔ (3) جن سے اشتراکِ عمل کیا جاتا ہے قبلِ فتویٰ نگاری اُن کے براہِ راست نجی عقائد معلوم کیے جائیں۔ (4) یہ دیکھا جائے ہے کہ اشتراک، بخوشی مذہبی جذبے سے ہے، یا بہ اضطرار ضرورتِ زمانہ کی رعایت سے۔ (5) یہ تحقیق کی جائے کہ کیا اِس طرح کی ضرورت واقعی نہیں ہے۔ (6) اِس کا اثبات کیا جائے کہ جو لوگ اشتراکِ عمل کرتے ہیں اُن کے اندر ختمِ نبوت کا عقیدہ کمزور پڑ جاتا ہے، وہ لوگ توہینِ انبیا کرنے لگتے ہیں، نماز میں .... کے خیال کو رسول کے خیال پر ترجیح دیتے ہیں وغیرہ یا نہیں۔ (7) اِس کا جائزہ لیا جائے کہ ہماری کلیتاً عدمِ اشتراک کی پالیسی اور غیروں کی زیادہ سے زیادہ کاوشِ اشتراک کی پالیسی، اِن دونوں پالیسیوں کا مجموعی نتیجہ اب تک فروغِ سنیت کے تئیں زیادہ بہتر رہا ہے یا فروغِ دیوبندیت و وہابیت کے تئیں، بلفظِ دیگر اپنوں اور غیروں کی دو الگ الگ پالیسیوں کے باعث ہندوستان میں ٹی ٹی ایسوں کا اضافہ ہوا ہے یا علمائے دیوبند کو کافر نہ سمجھنے والوں کا۔ (8) یہ صاف کیا جائے کہ کیا مٹھی بھر بریلوی تن تنہا حکومت سے کسی بھی ضروری مطالبے کو منوا سکتے ہیں۔ (9) آخر میں یہ نکتہ بھی بے نقاب کیا جائے کہ اِس سلسلے میں معترضین بلکہ مفتیانِ زُود نویس کہیں خود منافقتِ عملی کا کردار تو ادا نہیں کر رہے ہیں۔ ممکن ہے اِن امور پر غور و خوض کے بعد حضراتِ مفتیان کے سامنے تحریرِ فتویٰ سے قبل کچھ روشن پہلو سامنے آئیں۔

ملکی سطح پر عقائدی جائزہ پیش کریں متشددین

بالخصوص مذکورہ نِکات سے دو باتیں ضرور واضح کی جائیں۔ اولاً ہندوستان یا متحدہ ہندو پاک کے موجودہ منتسبینِ دیوبند کے براہِ راست خدا و رسول اور اولیاء اللہ سے جڑے اعتقادی و

نظریاتی حالات کا مختلف الجہات صحیح مفصل تجزیہ کیا جائے۔ ثانیاً خاص حلقۂ بریلی کے حضرات کو مستثنیٰ رکھ کر باقی عام مسلمانانِ ہند بشمولِ فضلاے مدارسِ دیوبندیہ، وعام حامیین ومتاثرینِ دیوبندیت کے خیالات ونظریات کا بایں طور جامع جائزہ لیا جائے کہ مخصوص علماے دیوبند کے تعلق سے اُن کا عقائدی سطح پر کیا موقف ہے۔ کتنے تکفیر کرتے ہیں۔ کتنے تضلیل کرتے ہیں۔ کتنے تاویل کرتے ہیں۔ کتنے متنازع عبارات کا انتساب غلط ٹھہراتے ہیں۔ مزید گوشے بھی نکالے جاسکتے ہیں۔ پھر جو نتائج نکلیں اُن کے اعتبار سے ایک مفصل تجزیاتی حکم جاری کیا جائے کہ از روے شرع کتنے تکفیر کی زد میں ہیں، کتنے تضلیل کی زد میں، کتنے تجہیل کی زد میں۔

تکفیر نہ کرنے والے کی تکفیر کا مسئلہ

کافر کو کافر نہ سمجھنے والے کا کافر ہونا بحیثیتِ ضابطۂ عام ہمارا جزوِ ایمان ہے۔ لیکن یہاں خاص تکفیرِ مخصوص علماے دیوبند کے سلسلے میں نکتہ یہ ہے کہ جن وجوہات پر اُن کی تکفیر کی گئی ہے اُن کو وہ خود بھی وجہِ تکفیر مانتے تھے۔ خود کو بایں طور بچاتے تھے کہ ہمارے کہنے کا مقصد یہ نہیں تھا۔ اُن کا یہ عذر اُن کے حق میں مردود ٹھہرایا جانا چاہیے کہ اُن کی دیگر تحریرات مجموعی طور پر اِس بات کی عکاسی کرتی ہیں کہ اُن کے فکر و قلم کسی حد تک بے لگام ہی تھے، بلکہ بعض انتہائی غلیظ۔ مزید زندگی ہی میں اُٹھے ہزار ہا احتجاجات کے باوجود اُنھوں نے رجوع بھی نہیں کیا جو بہر حال تقاضاے ایمان تھا۔ پس مخصوص علماے دیوبند کی تکفیر درست۔

ہاں دوسرے مرحلے کی تکفیر کرتے وقت اِس تاویل کی شرعی وزنیت یا بے وزنی کا جائزہ لیا جانا چاہیے۔ بالفرض علماے دیوبند کی تکفیر سے کفِ لسان کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ تب تاویلِ مذکور مزید قابلِ توجہ ہوسکتی ہے۔ جس کے بعد ضروری اتحاد و اشتراکِ عمل کے مسئلے پر تفصیلی تجزیاتی فیصلہ لیا جائے۔ رہی یہ بات کہ مخصوص علماے دیوبند کی تکفیر نہ کرنے والوں کے سلسلے میں ضابطہ پہلے سے طے ہے۔ تو یہاں چند باتیں عرض ہیں۔ اولاً یہ ضابطہ بالاجماع مسلم نہیں ہے۔ ثانیاً عہدِ اعلیٰ حضرت کے برخلاف آج مرحلۂ تکفیر کی زد میں ممکنہ طور پر آنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہو سکتی ہے۔ ثالثاً کچھ لوگ عصری ضرورت کے تحت اشتراکِ عمل کو وجہِ تکفیر جیسا ٹھہرا رہے ہیں تو ہم چاہتے ہیں کہ وہ اپنی بات مزید مضبوط بنیادوں پر رکھیں۔ رابعاً ہماری نظر میں تازہ اختلافاتِ اہلِ سنت حلقۂ بریلی کا حل بہت حد تک اِس میں مضمر ہے۔ خامساً ہم تازہ اختلافات میں بحیثیت عامی

واضح رہنمائی چاہتے ہیں۔ سادساً کچھ لوگ خود بہ خود از حد سخت فیصلے لیے جا رہے ہیں تو ہم چاہتے ہیں کہ وہ اصولی چیلنج قبول کریں۔ ہمیں اِس سے غرض نہیں کہ کیا حکم آتا ہے۔ متفقہ موقفِ علماے اہل سنت ہمارے عقیدے کا حصہ ہوگا۔ یہ آج ہی صاف ہے۔

یاد رہے ہم نے یہ گزارش تفصیل سے اِس لیے رکھی کہ آج بہ حالتِ مجبوری کیے جانے والے اشتراکِ عمل کو وجہِ تکفیر جیسا ٹھہرایا جانے لگا ہے جو جسارتِ کافرانہ جیسی ہے۔ ہم اِس مہم سے عاجز آچکے ہیں۔ اشتراکِ عمل ناگزیر عصری تقاضے پر عمل ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے رسول اللہ نے ضرورتاً مدینۂ منورہ میں اہلِ کتاب کو اپنا حلیف بنایا تھا۔ حِلفِ نبوی کی طرح آج کا اشتراکِ عمل نہ مذہبی ہم دردی ہے، نہ نظریاتی اتفاق، نہ کسی کے کفر کا انکار۔ اِس نوع کی عملی مثالیں پوری تاریخِ ملتِ اسلامیہ کے درمیان دیکھی جاسکتی ہیں۔

اشتراک میں غلبہ کی شرط ناممکن الحصول جیسی

رہی یہ بات کہ اشتراکِ عمل میں طبقۂ اہلِ سنت (حلقۂ بریلی) غالب رہے تو یہ اشتراک جائز ہے۔ اِس پر عرض ہے کہ حکومت کی نظر میں مختلف سطحوں پر ہندوستانی مسلمانوں کی نمائندگی کرنے والی سب سے بڑی تنظیم جمعیۃ علماے ہند، ہماری نہیں۔ مسلمانوں کے عائلی مسائل کا نمائندہ مسلم پرسنل لا بورڈ ہمارا نہیں۔ مسلمانوں کے سیاسی، معاشی، سماجی حقوق کی لڑائی لڑنے والی کوئی ایک بھی بڑی سیاسی یا غیر سیاسی تنظیم ہمارے پاس نہیں، مسلم لیگ ہمارے پاس نہیں، بدرالدین اجمل آسام ہمارے پاس نہیں، علما کونسل ہمارے پاس نہیں، مزید ایم پیز، ایم ایل ایز، منسٹرز ہمارے پاس نہیں۔ اِس کے علاوہ ہماری تقریریں، تحریریں، کتب و کتابچے، کانفرنسیں، جلسے جلوس سب زیادہ تر مسلکی۔ ہماری بالجملہ سوچیں مسلکی۔ ایسے میں ہمیں حکومت سے کچھ مطالبات رکھنے کی ناگزیر ضرورت پڑ جائے تو یقیناً تن تنہا کوئی بڑا مطالبہ نہیں منوا سکتے۔ اولاً ہمیں اِس طرح کے کاموں کا تجربہ نہیں، ثانیاً حکومت اور میڈیا کی نظر میں اِس جہت سے ہماری کوئی شناخت نہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ عموماً ہم غیر مسلکی میدانوں کے آدمی ہی نہیں، ہم خود کچھ کریں گے نہیں۔ دوسرے بُلائیں گے تو ہمیں اُس میں غلبہ چاہیے، ایسے میں ہم جیسے نئے اور بیگانے لوگوں کو دوسرے لوگ پہلے ہی دن کیوں سر پر بٹھائیں گے جب کہ وہ اُن میدانوں کے پہلے ہی سے بہت متحرک و فعال تصور کیے جاتے ہیں، جنھیں میڈیا بھی جانتا ہے، عام ہندو مسلمان بھی، حکومت بھی اُن

کے چہروں سے واقف ہے۔ اضافی پوائنٹ یہ کہ مذکورہ میدانوں میں اُن کی سابقہ خدمات بھی ہیں۔ اتنی کمزوریوں کے باوجود ہمارے ساتھ ایک مسئلہ یہ ہے کہ کسی بھی موقع پر اُن ساتھ مجبوراً نہ چائے پی سکتے ہیں، نہ ضرورتاً مصافحہ کر سکتے ہیں۔ اسٹیج پر بھی زیادہ دیر نہیں رک سکتے، سیدھے تقریر کرنے جائیں گے، فوراً تقریر کر کے چلے آئیں گے۔ آگے بڑھیے تو ایک مسئلہ یہ کہ اسٹیج پر کھڑے ہو کر اصلِ مسئلہ پر تقریر سے قبل سامعین پر یہ واضح کرنا ضروری ہوگا کہ اسٹیج پر جو چہرے نظر آرہے ہیں اُن سے ہمارے آج بھی سنگین مسلکی اختلافات ہیں۔ جب تک یہ توبہ نہیں کر لیتے، ہمارے نزدیک خالص کافر ہیں۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں یہ سادہ شرکت ہی ممکن ہے۔ یہ کوشش ناممکن الحصول جیسی ہے کہ اشتراکِ عمل میں طبقۂ حضراتِ بریلی غالب رہے۔

حلقۂ بریلی کے حضرات کی اندھادُھندی

ہم نے حلقۂ بریلی کے حضرات کے درمیان اختلافات کی تازہ لہر کو یک سر غلط قرار دیا تھا۔ اِن اختلافات میں مخصوص ذوق کے طبقے کی طرف سے جس غیر علمیت کا مظاہرہ کیا جارہا ہے وہ سخت افسوس ناک ہے۔ یہ عجیب وغریب قسم کی ’’اندھادھندی‘‘ ہے۔ یہ لوگ اُن یقینی نتائج سے بے پروا ہیں جو ہر حال میں نکل کر رہیں گے۔ موٹے طور پر یہی غور کرتے کہ دیگر فرقِ متعددہ سے قطعِ نظر، اعلیٰ حضرت کے معتقدوں میں یہ اختلافات کیوں اُبھرے۔ کچھ لوگ جن کی زندگی ہی فکرِ رضا کی ترویج میں گزر گئی، متنازع چیزوں کو اعلیٰ حضرت کے نام پر بھی کیوں قبول نہیں کرتے۔ مسئلے کے حقیقی مضمرات ودواعی کا للّٰہیانہ تجزیہ کیا جاتا جس کے بعد سنجیدہ حل کی جستجو کی جاتی۔

یہ اہم ذمہ داری تھی جس کے لیے حقیقی متانت وسنجیدگی، قطعی خلوص ونیک نیتی، عظیم قوتِ برداشت، نیز قبولِ حقائق کے لیے سچی کشادہ ظرفی جیسی علمی واخلاقی قدریں مطلوب تھیں۔ لیکن آسان نسخہ یہ تجویز کر لیا کہ مان کیوں نہیں رہے ہیں، ہم تو منوائیں گے۔ لڑنے کے لیے آستینیں چڑھا لیں۔ مزید صلح کلی وغیر سنی اور مخالفِ مسلکِ اعلیٰ حضرت جیسے مملوء الغضب جذباتی الزامات کی بوچھار کر دی۔ کلامِ پاک کی مشہور آیت ہے کہ دین میں جبر نہیں۔ مگر اِن لوگوں نے جبر کی حد کر دی۔ ویسے بات سمجھ میں آتی ہے کہ جبر کی موجودگی کی نفی صرف دین سے کی گئی ہے۔ ہم سے ایک سینئر دوست نے کہا کہ اسلام اگرچہ تلوار کے زور پر نہیں پھیلا مگر (لفظِ) مسلکِ اعلیٰ حضرت ضرور طاقت کے بل پر پھیلایا جارہا ہے۔ لوگ فونوں پر دھمکیاں دے رہے ہیں۔ نوازشات سے سرفراز کر رہے ہیں۔

سخت مزاجی پر اُتر آئے اِن لوگوں کی حالیہ منفی سرگرمیوں سے اِن کے ذہنی جمود کی حد کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اِس طبقے کے اِس تشدد سے نہ صرف بریلویت معمہ بن رہی ہے بلکہ محدود طور پر سنیت بھی اپنی فطرت ترک کر رہی ہے۔ دوسری طرف حقیقی گم راہوں کے لیے استعمال کی جانے والی واضح المعنی اصطلاحات مشتبہ المفہوم بن رہی ہیں۔ ظاہر ہے جب سنیوں پر بھی اِن کا اطلاق ہو سکتا ہے تو اِن کا استعمال اپنوں پر کیجیے یا غیروں پر، کوئی فرق نہیں پڑتا۔ البتہ ایک دردمند کے لیے ضرور، یہ تکلیف کی بات ہے کہ جن اصطلاحات کو بالخصوص قریب کے کبارِ سلف نے اپنی پوری دینی ومسلکی زندگی صرف کر کے واضح المعنی کیا تھا، آج بعض اپنوں ہی کے ہاتھوں اُن میں کھلبلی مچادی گئی ہے۔

تقلید اچھی کم ضروری زیادہ ہے۔ اصل پیروی نہیں قیادت ہے۔ ہر مومن کی خواہش ہے کہ وہ فقہ میں امام اعظم بن جائے، مگر نہ بننے کی صورت میں قلادۂ تقلید گردن میں ڈال لیتا ہے۔ اِس دنیا میں نہ سب اکابر ہوں گے، نہ سب اصاغر، نتیجتاً ہر چیز میں کچھ نہ کچھ لوگ دوسروں کی تقلید کرتے رہیں گے۔ قائدین بھی کسی نہ کسی چیز میں تقلیدِ دیگراں کے محتاج ہوں گے، قائدین بہر لحاظات کبھی مستغنی عن تقلید الآخر نہیں ہو سکتے۔ یہ صرف ذاتِ خدا کی شان ہے، وہ واقعی بے نیاز ہے۔ مگر نفسانیتی تشدد کے لوگوں میں تقلیدِ جامد کا وہ جذبہ جنم لے چکا ہے جو اُنہیں حق وناحق کی صریح بے رعایتی پر اُکساتا ہے۔ فی الواقع اِس بے تکی شدت میں نہ یہ حوصلہ، نہ یہ دم خم کہ امتِ مسلمہ کے لیے کچھ امرِ خیر کر سکے۔ یہ شدت ہر طرح کا دینی ومسلکی تعمیری بار اُٹھانے سے عاجز ہے۔ یہ اسلام وسنیت پر منطبق نہ ہونے والی نہایت غیر فطریت اور سراسر، اِفراط وتفریط ہے۔

تنگ ذہنی سے سنیت کا خسارہ

تنگ ذہنی یہ ہے کہ سماج میں کسی شخص کے تعلق سے جب تک یہ ثابت نہ ہو، وہ بھی اُن کے مزاج کے مطابق کہ بریلوی ہے، عموماً اُسے دوسرے ہی فرقے کا تصور کرتے ہیں۔ بظاہر ایک مسلمان اولِ نظر میں اُن کے نزدیک مشکوک العقیدہ ہے۔ اِس کا نتیجہ ہے کہ ایک طرف سنیت کے مستقبل سے خود مایوس ہیں، دوسری طرف بہت سے سیدھے سادے بریلوی سنی عوام بھی یہ دیکھ کر دُکھی ہیں کہ سنیت سمٹ کیوں رہی ہے۔ سیدھے سادے سنی لوگ جب کسی شہر میں جاتے ہیں، تو اُنہیں عموماً نہ اپنی مسجدیں نظر آتی ہیں، نہ تنظیمیں، نہ تحریکیں، نہ کتب وکتابچے، نہ اخبارات میں مضامین، نہ سیاست میں قائدین، نہ رفاہی میدانوں میں رضا کاران، نہ عصری اداروں میں پروفیسران، نہ

سرکاری دفاتر میں افسران، غرض اُنہیں ہر جگہ عموماً مایوسی ہاتھ لگتی ہے۔ یہ سادہ لوح حضرات یہ تمیز نہیں کر پاتے کہ زوال آمادہ سنیت نہیں بلکہ اعلی حضرت کے ماننے والوں میں بعض حضرات کی کج فکری اور غیر فطریت ہے جو اپنے آخری اور فطری انجام کو پہنچ رہی ہے۔ بریلوی سنیت اپنے بعض تجاوزات کا ازالہ کر کے پاکیزہ اور مہذب ہو رہی ہے۔

جماعتی جائزہ یہ ہے کہ معتقدینِ اعلی حضرت نے عموماً فقہ وفتاوی میں عمدہ کاوشیں کیں، مگر دیگر علومِ اسلامیہ یا علومِ عصریہ پر اصلاً توجہ نہیں دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کی نظروں میں ہم ایک محدود سوچ والا بریلوی فرقہ تصور کیے گئے۔ ہم سے لوگوں نے بالعموم تعمیری وتخلیقی کاموں کی امیدیں بھی نہ رکھیں۔ اُنھوں نے ہماری ذہنی اور نظریاتی ساخت کو اچھی طرح سمجھ کر ہمیں ہماری حالت پر چھوڑ دیا۔ اِس کے نتیجے میں ہم خود بھی یوں سمٹ گئے کہ ہم سے ایک خاص ذوق کے لوگ جڑے، باقی نہیں۔ مطلب یہ نہیں کہ دیگر مسالک کے لوگ نہیں جڑے، بلکہ عام مسلمان نہیں جڑے۔ وہ ہمارے سمجھے بھی نہیں گئے جب کہ دوسروں نے اُن سے تقرب کر کے یہ پیغام دیا کہ وہ اُن کے ہیں۔

سنیت کا خسارہ بایں طور ہوا کہ ہمیں بڑی سطح پر لوگوں سے ربط وتعلق وتعارف کا موقع ملا، نہ اصلاح کا۔ یہ فائدہ غیروں نے اُٹھایا۔ ہم لفظیات میں لگے رہے اور اَغیار مقصد میں۔ ہمیں معلوم ہے کہ کنارہ کش رہنے کے مفہوم کی حدیث ہے، مگر اقامتِ دین وسنیت پر تو پورا قرآن اور کل مجموعۂ احادیث نازل ہے۔ کیا لاکھوں لوگوں کا ایمان بچانا ضروری نہیں؟ آج کروڑہا کروڑ لوگ فاسد افکار سے متاثر ہیں، اِس رجحان میں مزید تیزی آرہی ہے، اِن کے ایمانوں کا تحفظ ضروری نہیں؟ رہا یہ کہنا کہ قربِ قیامت، حق سمٹے گا مگر کیا اِتنی جلدی؟ صرف ایک نسل کے اندر ہی؟ اگر ہاں تو پھر اسلام اپنی آخری پناہ، بریلی میں نہیں، حرمین میں لے گا، حالاں کہ وہاں کی گم راہ وہابیت ابھی اپنا بوریا بستر سمیٹنے کے موڈ میں نہیں۔ یہ اپنی کج فکری کو ہر حال میں صحیح ٹھہرانے کی ضد ہے اور کچھ نہیں۔

ہماری یہ نہایت مضرِ سنیت تبلیغی پالیسی ہے کہ ہمارے پاس آدمی ٹاٹن سنی بنا ہوا آئے، اُس کے علاوہ نہ کسی سے ملیں گے، نہ ہم کسی کی سنیں گے۔ ہاں اُسے منھ توڑ جواب دے سکتے ہیں۔ اِس پالیسی کا مطلب ہوا کہ جس کی اٹکے وہ آئے۔ ہماری یہ پالیسی خیر خواہانہ اور دردمندانہ نہیں بلکہ نہایت بے دردانہ اور سراسر ظالمانہ ہے۔ یہ ہرگز نہ قرآنی ہے، نہ نبوی، خالص ہماری اپنی ہے جس کی چوٹ سے سنیت لولہان ہے۔

ہم نے دیگر بزرگانِ اہلِ سنت کو فراموش کیا

ہم نے ایک غلطی یہ کی کہ عہدِ قریب کے دیگر بزرگانِ دین وسنت کو یک لخت فراموش کر دیا، نہ اُن پر کچھ لکھا، نہ اُن کی خدمتوں کو سراہا، نہ اُن کے نعرے لگائے۔ ہم نے ردِ وہابیہ کی پوری تحریک اور تحریک کے علم بردار جملہ علماے حق کا سلسلۂ ذہب جو اعلی حضرت تک کامیابی کے ساتھ وسیع ہوا، تقریراً وتحریراً کاٹ دیا۔ نتیجتاً ہم دیگر انفرادی واجتماعی محاذاتِ سنیہ سے کٹ گئے۔ ہمارے ساتھ ہماری بریلوی سنیت بھی محدود ہو گئی۔ یہ ہماری عام حالت رہی، جس کا نقصان سنیت کو ہوا۔

ظاہر ہے ایک شخصیت سے چاہے جتنی بڑی ہو، جذباتی طور پر ایک حد تک ہی لوگ جڑ سکتے ہیں۔ جب کہ ہندوستان کی دیگر عظیم خانقاہوں مثلاً، اجمیر، کلیر، سرہند، نظام الدین دہلی، بلگرام، کچھوچھہ، کاکوری، بدایوں، مارہرہ وغیرہ سے جذباتی طور پر جڑے لوگ چاہیں تو ”کسی بزرگ کی مخالفت نہیں“ کی پالیسی اپنا کر اپنے ہی خانقاہی بزرگوں کے فرمودات ومعمولات پر چلتے رہیں، وہ کسی کا نعرہ نہ لگائیں، نہ کسی کا زیادہ تذکرہ کریں، صرف اپنے سلسلے کے بزرگوں کے تذکرے کریں اور اُنہیں کے نعرے بلند کریں تب بھی راہِ سنیت پر گام زن قرار پائیں گے۔ یہی اکثر جگہ ہوا بھی۔ سیدھے سادے لوگ دین پر چلتے رہے جب کہ ساری سنیت کے بزعم خود دعوے دار ہم سمٹ گئے۔ ہم اُن کی مزید اصلاح کر سکتے تھے مگر اپنے رویے سے ہم نے اُن کی حق تلفی کی۔ ہم اِس پر بلاوجہ حیرت زدہ رہیں کہ دنیا ہم میں سمٹنا چاہیے تھی، دنیا میں ہم کیوں سمٹ گئے۔ یقیناً دنیاے اسلام، دین اور اسلام کے نام پر ایک ہو سکتی ہے، زیادہ سے زیادہ مسلکِ اہل سنت کے نام پر، بس۔ چودھویں صدی کی کسی ایک شخصیت یا حلقہ جاتی مسلکی اصطلاح کے نام پر نہیں، آپ جتنی کوشش کر لیجیے۔ اصطلاح سے چاہے مراد جو ہو۔ حلقہ جاتی اصطلاح کے زیرِ علَم آپ جتھہ ہی رہیں گے، جماعت ہرگز نہیں بن سکتے۔ عنوانی اختلاف کا معیارِ حق وباطل قرار دینا مزید باعثِ حیرت ہے۔

یہ جھگڑا۔ تشدد کے خاتمے کا آغاز ہے

اعلیٰ حضرت کا سہارا لے کر کچھوچھہ، مارہرہ، بدایوں، دعوتِ اسلامی، سنی دعوتِ اسلامی، جامعہ اشرفیہ، فرزندانِ اشرفیہ سے لڑنا بلکہ تازہ حالات کے مطابق خانقاہِ عارفیہ الہ آباد کے خلاف موڈ بنانا، خانقاہِ شرافتیہ بریلی سے بھڑ جانا ایک طرف۔ یہ جھگڑا تشدد وجذباتیت کے خاتمے کا آغاز ہے۔

تازہ سخت مزاجی اپنے وجود کی بقا کی ناکام جنگ لڑ رہی ہے۔ یہ وہ عمارت ہے جس کی بنیادیں ہل چکی ہیں۔ وہ درخت ہے جو اپنی جڑیں چھوڑ چکا ہے۔ وہ چراغِ سحری ہے جو آخری مرتبہ بھڑک کر ہمیشہ کے لیے گل ہونے جا رہا ہے۔ جب کہ اعلیٰ حضرت خالص علم و یقین اور سچی سنیت کا نام ہے۔ موجودہ تخریب پسندی سے آپ کی شخصیت کہیں زیادہ بلند تر۔ آپ نمائندۂ حق و صداقت تھے۔ آپ حق کی طاقت تھے، حق آپ کی طاقت۔ آپ کی ذات کو اللہ صبحِ قیامت تک بلند رکھے گا۔

جامِ نور مجلہ نہیں، ایک سوچ ہے- نئی نسلِ اہلِ سنت کی صالح سوچ

جہاں تک جامِ نور کی بات ہے تو اُس کے حرف حرف سے اتفاق کی ضرورت، نہ یہ ممکن کہ یہ صرف کلامِ خدا اور رسول کا خاصہ ہے۔ لیکن مجموعی طور پر مجلّے نے جماعت بھر کو جس قدر حالات آگاہی سے قریب کیا ہے اور فکر و شعور کا بخشا ہے، اُس کا اعتراف ایک منصف کے لیے اپنی حیثیتِ انصاف پسندانہ کی لاج کے لیے ضروری ہے۔ تاریخ کے دامن ہر طرح کے دوائرِ فکر و عمل کی بغاوتوں سے بھرے ہوئے ہیں، کہیں استبداد کے خلاف، اصلاحات کے لیے، کہیں اِس کے برعکس۔ جامِ نور جماعت میں تعمیری اصلاحات دیکھنا چاہتا ہے۔ یہ نو تجربہ ہے مگر اِس کی برہمی میں خلوص و اپنائیت ہے، مکر و غیریت نہیں۔ جامِ نور کے اِس اقدام کو بغاوت کہا جائے تو یہ جارحیت سے صالحیت کی طرف ہے۔ پچھلی ایک دہائی سے بریلویت کے اندر جو جدید بریلویت اُبھری ہے، جامِ نور اُس متشدد ظاہرہ کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہے اور بالکل صحیح آمادہ ہے۔

پھر بھی اِسے مجلّے کا بے پناہ تحمل ہی کہیے کہ اِس نے کھل کر آج تک وہ سب بھی نہیں کہا جو زیرِ نظر تحریر میں ناچیز کہنے پر مجبور ہے۔ مجلّے نے عموماً حالات کے تجزیے پیش کیے ہیں، عصری تقاضات رکھے ہیں، مجلہ درد و کرب سے نڈھال، بزرگانِ جماعت کے گرد ہمیشہ صرف رویا گڑگڑایا ہے۔ مگر دل سے جو آہ نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔ آج دین و سنیت کے تئیں دردمند علما و مشائخ کی گراں قدر حوصلہ افزائیاں اور غلبۂ دین کے تئیں فکرمند فاضل نئی نسلِ اہلِ سنت کی مثبت توانائیاں جامِ نور کے ساتھ ہیں۔ تازہ حالات میں جامِ نور مجلہ نہیں ایک سوچ ہے جسے جماعتِ اہلِ سنت کے ''صالح شعور'' کا نام دیا جا سکتا ہے۔

صرف سچ پر یقین رکھنے والی یہ عموماً فاضل نئی نسل جسے غصے میں ''چُنّے مُنّے مصاحیوں'' سے تعبیر کر کے اپنے ذوق کی تسکین تو کی جا سکتی ہے مگر مضبوط بنیادوں پر قائم اُس کے فکری قدموں کو

متزلزل کرنا ممکن نہیں۔ صالح عزائم سے لبریز یہ نسل، علم و یقین کے اجالوں کی سفیر ہے۔ یہ سراپا عشق و جنون آگ کے متزخر دریاؤں اور پتھر کے متکبر ہمالیاؤں کو آئینہ دکھا کر اپنی ایمانی منزلوں کو حاصل کرنے کے لیے پُرعزم ہے۔ جھوٹے پروپیگنڈے نہ اِس کا کچھ بگاڑ سکیں، نہ خود اِسے اِس مکاری کی عادت۔ ''ہر مخالفت کا جواب کام'' اور ''زمین کے اوپر کام، زمین کے نیچے آرام'' اِس کی سوچ کا محور ہے۔ اِس کے سامنے صرف ایک مصلحت ہے کہ دین و سنیت کے حق میں خیر ہو۔ باطل سے دبیں گے نہیں، حق سے بھِڑیں گے نہیں، یہ اِس کا ایمانی نعرہ ہے۔ اللہ بس سہارا ہے۔

جامعہ اشرفیہ - حلقۂ بریلی کی لاج

جامعہ اشرفیہ کے بریلوی جماعت پر احسانات یقیناً شمار سے باہر ہیں۔ خوردہ کاری سے صرفِ نظر گزشتہ تین چار دہائیوں کے دوران جامعہ اشرفیہ بریلوی سنیوں کا سب سے بڑا علم و عقل یا زبان و قلم رہا ہے۔ خدانا خواستہ حافظِ ملت نے بروقت اشرفیہ قائم نہ کیا ہوتا تو بریلویت سے متعارف سنیت کا آج سخت برا حال ہوتا۔ اِس عرصے میں اشرفیہ نے بریلویت کی لاج بچائی ہے، آج بھی بچا رہا ہے بلکہ آج افراط و تفریط کے ماحول میں مزید عزت و آبرو ہے۔ مسلکِ اہلِ سنت بالخصوص فکرِ رضا کے تحفظ و ترقی کے لیے جس تسلسل اور ذمہ داری کے ساتھ لشکر و سپاہ جامعہ اشرفیہ نے فراہم کیے ہیں اور کر رہا ہے اُس کا اجر بعض احسان فراموش بریلویوں کا اعتراف ہے نہ انکار۔ دراصل اشرفیہ کو اپنی بزرگی اور عظیم ذمے داریوں کا احساس ہے۔ اشرفیہ کی بنیادوں میں امامِ اعظم و غوثِ اعظم کے آستانوں سے لائے گئے ذراتِ خاکی اور سید العلما، مفتی اعظم ہند، مجاہد ملت وغیرہ کے ہاتھوں مس کی ہوئی اینٹیں موجود ہیں۔ اِس لیے ناممکن ہے کہ اشرفیہ کسی تخریبی طاقت سے متزلزل ہو جائے۔ اشرفیہ کی بے لوث دینی خدمات بتوفیقہٖ تعالیٰ تا خندۂ صبحِ قیامت جاری رہیں گی۔

تربیتِ صدر الشریعہ کا خلاصہ حضرت حافظِ ملت نے بنیادوں کو مضبوط کر کے ہی اُس پر قلعۂ اہلِ سنت یعنی اشرفیہ کی تعمیر کی ہے۔ اشرفیہ کے نظم و نسق کے ظاہری ذمے داروں سے قطعِ نظر اُس کی اصلی دیکھ ریکھ آج بھی حافظِ ملت کی روحِ دردمند کرتی ہے۔ صحنِ اشرفیہ میں موجود آپ کا مزار دراصل کنٹرول روم آف اشرفیہ ہے۔ چوں کہ آپ آلائشِ نوم و تعب کی دسترس سے آزاد ہیں، اِس لیے اشرفیہ کے تئیں آپ کی نگرانی چوبیسوں گھنٹے جاری ہے۔ اُس وقت بھی آپ دیکھ ریکھ فرماتے ہیں جب ساری دنیا تھک کر سو جاتی ہے۔ ایسی صورت میں کفر و بدمذہبی کی برق باریاں ہی نہیں، حسد و کینہ کی چنگاریاں

بھی اشرفیہ کو چھو کر نہیں گزر سکتیں۔

فروغِ مسلکِ اہل سنت کے ساتھ خاص فکرِ رضا کی ترویج و ترقی کے تئیں اشرفیہ کی بے مثل سچی خدمات کو پروپیگنڈوں سے تعبیر کر کے بعجلت دوسروں کی خوردہ خدمات (یہ بھی اہم ہیں) کو بڑی فراغ دلی سے مقابلتاً شمار کرانے والوں سے متعلق اولاً یہی کہنا ہے کہ غیر ذمہ دار لوگ کب کیا کہہ دیں، کچھ پتا نہیں۔ ثانیاً کاش یہ لوگ اعلی حضرت کی خدمتوں کے تذکرے کے وقت دوسرے سابق و معاصر بزرگوں کے ساتھ بھی اِسی کشادہ ظرفی کا مظاہرہ کریں۔ کاش تذکرۂ رضا کے ساتھ ضمناً ہی سہی متحدہ ہندوستان کے اُن بے شمار سابق و معاصر علما و مشائخ کی دینی و مسلکی خدمتوں کا بھی آٹے میں نمک کے برابر تذکرہ کر لیا کریں کہ جن کی انتہائی بنیادی علمی کوششوں کی بدولت مختلط ہو رہے حق و باطل کے درمیان اولین خطِ امتیاز کھنچا۔ ہندوستان میں ردِ وہابیت کی یہ خشتِ اول تھی اِسی پر آگے تعمیرات کھڑی کی گئیں۔ کاش لوگ خشتِ اول کی اہمیت سمجھیں۔

خدا توفیق مرحمت فرمائے کہ یہ لوگ دیگر بزرگوں کے بھی نعرے لگائیں، دیگر خانقاہوں میں زبردستی اپنی پسند کے نعرے لگوانے پر مُصِر اپنی خانقاہوں، جلسوں وغیرہ میں بھی دیگر کبارِ خادمینِ دین و سنت کے نعرے بلند کریں، اُن کی خدمات پر کتابیں لکھیں، اُن کی سوانح پر نمبر زنکالیں۔ یقیناً یہ بزرگ مستحق ہیں کہ اعلی حضرت کے ہزاروں نعروں کے درمیان ایک نعرہ اُن کا بھی لگے، ہزاروں کتابوں میں ایک کتاب اُن پر بھی لکھی جائے، ہزاروں نمبروں میں ایک نمبر اُن پر بھی نکالا جائے، ہزاروں کانفرنسوں میں ایک کانفرنس اُن پر بھی کر لی جائے۔ ’’جو کچھ بھی اِس صدی میں ہے تنہا رضا کا ہے‘‘ گنگنانے کا مطلب یہ ہر گز نہیں کہ چودھویں صدی میں اعلی حضرت کے علاوہ باقی سارے علما و مشائخِ ہندِ متحدہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے تماشاے دیر و حرم دیکھ رہے تھے۔ یہ سوچ دوسرے بزرگ علماے برحق کی خدمتوں کے ساتھ ناانصافی ہے۔ جب کہ ناانصافی کی حد یہ ہے کہ دوسرا کچھ ایسا کر لے، کسی پر کچھ لکھ دے یا جلسہ یا سمینار کرا لے، تو کہا جائے کہ یہ مرکز سے توجہ ہٹانے کی کوشش ہے۔

مصباحی اللہ کا رزق کھاتے ہیں- دین کا کام کرتے ہیں

مصباحیانِ اشرفیہ کے لیے کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ اعلی حضرت سے اختلاف کرتے ہیں، مگر چندہ اُنھیں کے نام پر بٹورتے ہیں یا اعلی حضرت کا کھاتے ہیں اور اُن کے نام سے چِڑھتے ہیں۔ ہمیں حیرت ہے کہ کس طرح امتِ مسلمہ کے جملہ صحابہ و اولیا و علما کو یک لخت نظر انداز کر کے صرف ذاتِ اعلی حضرت سے نسبت کی جاتی ہے، یہاں تک کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت کو بھی فراموش کر دیا جاتا ہے۔ ویسے ہم ایسے معترضین کو دوٹوک بتانا چاہتے ہیں کہ ہم صرف دین کا کام کرتے ہیں اور صرف اللہ کا رزق کھاتے ہیں۔ نظریاتِ علماے اہل سنت کا فروغ ہمارے نزدیک دینی کاموں کا حصہ ہے، اِس لیے الحمد للہ ہم بقدرِ توفیقِ الٰہی یہ بھی کرتے ہیں۔ نیز اللہ کا عطا کردہ رزق ہمارے لیے رسول اللہ کا صدقہ، اولیاے صالحین کا فیض اور ہمارا کسب ہے۔ لوگ دینی اداروں کی اِسی سوچ کے ساتھ مالی معاونت بھی کرتے ہیں۔ مزید ہماری گزارش ہے کہ جو لوگ جن دینی اداروں کے مذکورہ اصولوں سے اتفاق نہیں رکھتے وہ کل نہیں آج ہی یہ معاونتی سلسلے بند کر دیں۔ ویسے یہ ہم اپنے ایمانی جذبوں کی روشنی میں کہہ رہے ہیں۔ ورنہ اِس دنیا میں رزق سے کون محروم۔ اِس وضاحت کی بھی ضرورت نہیں تھی مگر مصباحیانِ اشرفیہ کے علم و کارگزاری پر لوگوں کے بڑھتے اعتماد سے پیٹ پرستوں کے مادی مفادات پر ضرب لگی ہے۔ ’’فاتح دیوبندیت‘‘ کے بعد غنائم مجاہدوں میں کیوں تقسیم ہو رہے ہیں، گھر میں آنا چاہیے تھے۔ یہی جھگڑا ہے۔

سخت مزاجوں کے پاس صرف خارجے کا رجسٹر

مرکز کے عرسی اسٹیج اب خانہ جنگی کی حوصلہ افزائی کے اڈے بن کر رہ گئے ہیں۔ ہر سال اِس خوش خبری کے بجاے کہ گم راہوں کے کس گروپ کو قبولِ مسلکِ سنیت کرا دیا گیا ہے، یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ اِس سال فلاں حصۂ احباب کو خارجِ سنیت کیا جا رہا ہے۔ کاش یہ لوگ دعوتِ اسلامی کو سنیت سے نکالتے وقت تبلیغی جماعت کو سنی بنا لیتے، سنی دعوتِ اسلامی کو مخالفِ مسلکِ اعلی حضرت کہتے وقت جماعتِ اسلامی کو موافقِ مسلکِ اعلی حضرت کر لیتے۔ اشرفیہ کو صلح کلی ٹھہراتے وقت دیوبند یا ندوہ کو کلمۂ سنیت پڑھا دیتے۔ جام نور کو خارجِ سنیت کرتے وقت اُس کے متبادل کا انتظام کر دیتے۔ یہ ایک چیلنج تھا۔ سنیت کو balance رکھنے کے لیے بھی ایسا کرنا ضروری تھا۔ اِس سے ثابت ہوتا کہ جماعت کے لیے متشدد ین کا وجود خالص مضر نہیں ہے۔ مگر منھ کو خون لگا تو صرف خوں آشامی ہی سوجھ رہی ہے۔

غیر رسمی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ چوں کہ اعلی حضرت نے بہت زیادہ کام کر کے اپنے ماننے والوں کی طرف سے ہمیشہ کے لیے کفارہ ادا کر دیا ہے۔ اِس لیے بعد میں کسی فردِ معتقد کا سرگرمِ عمل رہنا اعلی حضرت سے عداوت اور آپ کے مسلک سے بغاوت کے مترادف ہے۔ نتیجتاً گناہِ بے گناہی کے اِن مرتکبین کی گردنِ عزت و آبرو پر سیدھے ہی تیشۂ قلم چلا کر اُنھیں واصلِ حظیرۂ اَغیار کر دیا جاتا ہے۔

سچ یہ ہے کہ آج یہ لوگ سنیوں ہی کے ایمانوں کی بلی دے دے کر خود تعیین کردہ مسلکِ اعلی حضرت کو بچانے میں لگے ہوئے ہیں۔ اِن لوگوں نے مسلک جو راستے کے معنی میں ہے، اُس پر بھالے کھڑے کردیے ہیں، جیسے ہی کوئی گزرا، یہ لوگ مسلکی بھالوں سے اُس کی تکا بوٹی کرڈالتے ہیں۔

یہ لوگ اِس پر دھیان نہیں دیتے کہ اعلی حضرت یا آپ کے فکر و مسلک پر یہ کس قدر ظلم ہے کہ اُسے سنیوں کے ایمانوں کا خون پلایا جائے۔ دوسری بات یہ کہ جماعت سے تقریباً سب کو نکال دینے کا مطلب چند باقی ماندہ افراد ہی کا خروج از جماعت ہے۔ باقی ماندہ ہی پر ''شُذَّ'' صادق آتا ہے۔ ''آدھے اِدھر جاؤ، آدھے اُدھر جاؤ، باقی میرے پیچھے آؤ'' کی پالیسی پر عمل پیرا یہ لوگ پیچھے مڑ کر دیکھیں کہ اب بچا کون ہے جس کی سنیت بچانے کی ضرورت ہے۔ یہ لوگ حقیقتاً خوابوں کی زندگی جی رہے ہیں۔ اِنہیں یہی غرور ہے کہ کوئی کتنا ہی کچھ کرلے، حکومت ہماری رہے گی۔ وہ بھی عدل و انصاف کی نہیں جبر واستبداد کی۔ خلافتِ راشدہ کے بعد ملوکیتِ جابرہ کی طرح۔

فکر ہی مثبت اور سوچ ہی اصولی نہیں

دراصل اِس ذوق کے حاملین باستثنائے اِکا دُکا، کی فکر ہی مثبت اور سوچ ہی اصولی نہیں۔ کسی بھی مسئلے کو اصولوں سے سمجھنے کے بجائے نرے بے تکے پن پر اُتر آتے ہیں۔ مخالفت میں اُن کی جتنی باتیں عموماً نظر سے گزریں وہ حد درجے کی پست فکری، خُلقی زوال، عقلی اِفلاس اور تقاضاے انصاف کے خون پر مشتمل رہی ہیں۔ ظاہر ہے علم و یقین کی اِس دنیا میں ایسی بے فیض سوچ کا مستقبل محض تاریک ہے۔ دین و شریعت جس قدر جامع اور دقائق پر مبنی ہے، اُسے جتھہ پرستی کے ذہن سے ہرگز نہیں سمجھا جاسکتا ورنہ جہالت ہی نہیں علم بھی فتنہ بن جاتا ہے۔ تاریخ اِس پر شہادتیں دے سکتی ہے۔ خاص ہدایت کے لیے بہرحال توفیقِ الٰہی شرط ہے۔ تاہم غلط بات کے ثبوت میں دھڑا دھڑ مطلب پرستانہ دلائل جمع کرنا مناظراتی تاریخ کی قدیم روایت ہے۔

ذوق یہ بنالیا ہے کہ اِن سے منہ زوری جاری رکھی جائے۔ پھنسے کسی طرح سے کوئی فالتو منہ زوری میں۔ توجہ نہیں دے گا تو فتوے دیں گے، اعلی حضرت کا دشمن کہیں گے، سنیت سے نکالیں گے، گم راہ و بد دین ٹھہرائیں گے۔ سیدھے سادے انسان کو بے صبر کرہی ڈالتے ہیں۔ جس کے بعد خود بھی فضول نگاری کرتے ہیں اُس سے بھی کراتے ہیں۔ بات کے کچھ اصول ہوں، تو کچھ حل بھی نکلے۔ گفتگو ایک پنگا بن کر رہ جاتی ہے۔ نتیجتاً ایک شریف آدمی اِس وحشت سے اللہ کی پناہ چاہنے لگتا

ہے۔ جب کہ یہ نعرے باز منہ زور گلیارے میں نکل کر جشنِ فتح منانے لگتے ہیں۔ ذہنیتِ عاطل سے تنگ آچکے جماعت کے ایک صاحب نے کہا کہ ''ہم نے تو کئی سالوں سے اِس کے تعلق سے کچھ ہی لکھنا بند کردیا ہے، ہم نے سوچ لیا ہے کہ ہم ہیں ہی نہیں اِس فرقے میں'' جب کہ ایک دوسرے صاحب نے کہا کہ ''بریلویتِ تازہ سے شکست ہی اِس پر فتح ہے''۔ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ لوگ کس قدر بیزار ہوچکے ہیں۔

جماعت کے فکر و عمل کی دنیا کا وائرس ہیں یہ لوگ

ذوق ہی کی دین ہے کہ یہ لوگ ہر سنی دھڑے کا دو تین سال جم کر پیچھا لیتے ہیں، پھر نیا شکار تلاش کرلیتے ہیں۔ کئی سالوں پہلے جام نور کے پیچھے پڑ گئے تھے، پھر دعوتِ اسلامی کو نیزے میں چھید لیا، اب اشرفیہ پر آدھمکے۔ یہ لوگ حسبِ روایت دو تین سال اشرفیہ کے در و دیوار سے سر پٹخ کر وقت پورا ہونے پر کسی نئے پھلتے پھولتے شکار پر جھپٹ پڑیں گے۔ مستقبل کے لیے کئی ایک محاذات اُن کی بلیک لسٹ پر، اَبھی سے ہیں بھی۔ یہ لوگ ہر کسی پر بھوکے حیوانِ مفترس کی طرح حملہ آور ہوتے ہیں اور تباہی مچا کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ بات تلخ ہے مگر کردار و عمل مُظہِر ہے کہ یہ لوگ نہیں ناکارہ طاقتیں ہیں کہ جس طرف رخ کرلیں، افراتفری مچ جائے، جس بستیِ فکر و عمل میں گھس جائیں، تعطل چھا جائے، جماعت کے فکر و عمل کی دنیا کا وائرس ہیں یہ لوگ کہ جماعت کی متحرک طاقت کا چکا جام کردینا چاہتے ہیں۔ بیک دم کسی پر بھی قیامت بن کر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ مگر قیامت تو اُنہیں پر آسکتی ہے جن کے دلوں میں گرمیِ ایمان نہ ہو۔ اشرفیہ کو اِس پنگے سے جلد ہی نجات مل جائے گی، انشاء اللہ۔ اشرفیہ کا صبر و تحمل اور تعمیری نظریہ ہر منفی طاقت پر بھاری ہے۔ اشرفیہ ''ہر مخالفت کا جواب کام'' پر عمل پیرا ہے جو عزیزیت کے پردے میں ربانی اصول ہے جسے شکست نہیں۔

متشددین میں بعض لوگ بے حد فتّین

متشددین میں بعض لوگ بے حد فتین ہیں۔ یہی دراصل تازہ فتنہ انگیزیوں کی کمان سنبھالے ہوئے ہیں۔ جنھوں نے حالیہ دنوں بعض مصباحیوں کو دوٹوک ''تباہ و غارت'' ہوجانے کی دعاے بد تک دے ڈالی، حالاں کہ اِس کے بدلے وہ دعاے خیر بھی کرسکتے تھے۔ تین سال قبل ذاکر نگر (نئی دہلی) میں دورانِ تقریر کہا تھا کہ اُن کے چند شاگرد (مراد مصباحی) ''بندر بن گئے ہیں''۔ تقریر کے دونوں

ٹکڑے ملا کر بات سمجھ میں آتی ہے کہ ”چند مصباحی بندر بن گئے ہیں، اللہ اُن کو غارت و ناپید فرما دے“۔ یہ بات بالکل قرینِ قیاس ہے کہ یہ سب ترتیب سے کہتے وقت کلامِ الٰہی کی مشہور آیتِ غضب ”کونوا قردۃً خاسئین“ پیشِ نظر رہی ہو۔ یہ خالص بشری کمزوری بلکہ انتہا درجے کی کینہ پروری اور مغلوب الغضبی ہے جس سے اللہ بے نیاز، اُس کا رسول بے نیاز، اُس کا دین بے نیاز۔

تقریباً پچھلی ایک دہائی سے جماعت کے اندر جس نفسانیت کو فروغ دے رہے ہیں، دعوتِ اسلامی و سنی دعوتِ اسلامی کے رد میں اعصاب شکن طاقت آزمائی کے ساتھ بالخصوص بعدِ خروجِ اشرفیہ جس طرح اشرفیہ و مصباحیانِ اشرفیہ کے پیچھے پڑ گئے ہیں، بلکہ جس طرح وہ بریلوی سنی دنیا میں کسی کو بھی نہیں چھوڑ رہے ہیں، اُس کے پیشِ نظر، حالیہ دنوں یہ ”فتنۂ اہل سنت“ سے کم نہیں۔ حالاں کہ یہ بات معلوم رہنا چاہیے کہ علم و تحقیق کے اِس دور میں چنگیزی تیوروں کا زمانہ کلیتاً رخصت ہو چکا ہے۔ آج جس طرح سیاست سے نوابیت اور بادشاہی رخصت ہو چکی ہے، اِسی طرح مذہب سے برہمینت و پاپائیت کافور ہو چکی ہے۔ بہتر ہے اپنی بزرگی و عمر درازی کا لحاظ کریں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ ابھی بہت کچھ بگڑا نہیں ہے۔ لیکن خیر بہر حال جتنی بھی ہے، اِسی میں ہے۔

مرکز کے عرسی اسٹیج انتشار کے اڈے

پچھلے کچھ سالوں تک یہ مشہور تھا کہ جدید عرسی اسٹیج نسبتاً زیادہ علمی اور محتاط ہے۔ مگر ہمیں لگ رہا ہے یہیں زیادہ انتشار انگیزی ہو رہی ہے۔ دعوتِ اسلامی اور سنی دعوتِ اسلامی کے لیے یہ اسٹیج مقتل سے کم نہیں۔ کُند کُڈّھے سے ذبح کیا جاتا ہے یہاں اِن بے چاروں کو۔ تاکہ مریں ہی نہیں، دردناک موت مریں۔ گاؤں کے سادہ دل زائرین کان بلکہ منھ کھول کھول کر سنتے ہیں کہ کبھی صراحت کبھی اشارے میں یہ کس کے خلاف گرجا برسا جا رہا ہے، بے چاروں کو آخر تک کچھ پلے نہیں پڑتا۔ کسی کے بتانے پر کچھ سمجھتے ہیں تو اسٹیجی پہلوانوں کی حمایت کے بجائے سنیت کے اِس دردناک انتشار اور حشر پر اُف کر کے رہ جاتے ہیں۔ وہ کچھ سمجھ نہیں پاتے، نتیجتاً اعلیٰ حضرت سے اپنی عقیدت کو مولویوں کے جھگڑوں سے الگ کر لیتے ہیں۔ وہ عرس سے خوش نہیں مایوس ہو کر لوٹتے ہیں۔ سادہ لوح سنیوں کے لیے یہ بڑا نازک مرحلہ ہے۔ ناسمجھی سے کوئی سخت فیصلہ بھی لے سکتے ہیں۔ متشددین تو مردود و مرتد کر کے رہ جائیں گے مگر اُن بے چاروں کی عاقبت تباہ ہو جائے

گی۔ اسٹیج سے ہر سال لاکھوں اہلِ سنت کے ایمانوں کو بے وقعت ثابت کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے جو صلح کلی اور بد مذہب کو صلح کلی اور مذہب نہ کہے وہ بھی پلپلا۔ اب خود کار فتوی لے کر لوگوں پر چسپاں کرتے جائیے۔ رُکے تو خود بھی پلپلے۔

بریلی اپنی تاریخی اہمیت کھو رہا ہے

دوسری طرف حالیہ عرسِ رضوی میں متشددین کی طرف سے ایک تازہ کتاب سامنے آئی جو واقعی گنبدِ دماغ کا چراغِ عقل بُجھا کر تحریر کی گئی ہے، جس کے خام کار خامہ بردار کو اعزازاً اسٹیج پر چڑھا کر اُس کی عزت افزائی کی گئی، اِس طرح کتاب و صاحبِ کتاب کی تحسین کی گئی۔ ہم یہاں کتاب کے طبعِ اول سے چند جملے نقل کریں گے جن کا نشانہ بالعموم فرزندانِ اشرفیہ اور بالخصوص بزرگ اور تعمیری ذہن رکھنے والے مولانا یاسین اختر مصباحی ہیں:

”توبہ کا دروازہ کھلا ہے، ورنہ بڑے بڑے پڑھے لکھے واصلِ جہنم ہو چکے، کتابچیوں کے مصنف کی کیا گنتی“ (ص 40)۔ ”دولت اور آسائشِ دنیا جب حاصل ہو جائے تو پھر اِنسان ابلیس اور فرعون بن جاتا ہے“ (ص 107)۔ ”سنتے تھے کہ پڑھے لکھے لوگ پہلے جہنم میں جائیں گے، اب یقین ہو گیا“ (ص 111)۔ ”اِس کا قوی امکان ہے کہ کبھی کسی حیثیت سے وہابی مرتد ہو جائے“ (ص 121)۔ ”سنتے تھے کہ قربِ قیامت میں مفتری کذاب دجال کی آمد ہو گی، تو کیا قیامت قریب آ گئی“ (ص 121)۔ ”آپ کا دماغی فتور اِس حد کو پہنچ گیا ہے کہ اُس کا علاج داروغۂ جہنم ہی کر سکتے ہیں (ص 128)“۔

اِن جملوں کو نقل کرنے کے بعد ہم صرف اتنا کہیں گے کہ کتاب یا صاحبِ کتاب کی تصدیق یا تحسین سے کتاب یا صاحبِ کتاب کی معتبریت نہیں بڑھتی بلکہ مصدقین کی علمی و شرعی معتبریت پر حرف آتا ہے۔ اِس سے ذمے داروں تک کی علمی و اخلاقی گراوٹ کی حد کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ سنا ہے اب اُس کی گردن میں طوقِ خلافت ڈال دیا گیا ہے۔ ایسی صورت میں کیا یہ ممکن ہے کہ ہم بریلی کے ہر فتوے کو آنکھ بند کر کے مان لیں، ہرگز نہیں۔ تلخ ہے مگر سچ ہے کہ پچھلے چند سالوں سے بریلی جسے آج بھی کچھ لوگ مرکز تصور کرتے ہیں، کچھ اِسی طرح کے غیر ذمے دارانہ عمل سے اپنی تاریخی اہمیت کھوتا جا رہا ہے۔ ممکن ہے ہماری یہ بات اعلیٰ حضرت پر تنقید ٹھہرائی جائے، پروپیگنڈوں کا

زمانہ ہے۔ مگر اعلیٰ حضرت کی تحقیقات اور فتاوی کو اِس سے کیا نسبت جو آج بریلی میں ہو رہا ہے۔ آج کے ہر تکے بے تکے بریلوی فتووں کو آپ کی طرف منسوب کرنا سراسر ظلم ہے۔ مرکز بھی اعلیٰ حضرت تھے یا ہیں نہ کہ موجودین۔ آج ملکی سطح پر جماعت میں ایک نہیں کئی مراکز ہیں۔

شدت پسند بزرگوں سے صاف صاف باتیں

تازہ حالات میں بعض بزرگوں کی اِس شدت پسندی پر ہمیں چند باتیں بہت صاف صاف عرض کرنا ہیں کہ بریلویت سے منسلک لوگوں سے تو وہ بہتر ہیں جو دوسری خانقاہوں سے جڑ کر یا کسی خانقاہ سے نہ جڑ کر اپنی وسعت کے اعتبار سے خدمتِ دین و سنت کر رہے ہیں، وہ لوگ بریلویت سے نہ جڑے، یہی بہتر رہا۔ کیوں کہ یہاں سنیت اور مسلکِ اعلیٰ حضرت پھیلانے کے چکر میں خود ایمان خطرے میں پڑنے لگا ہے۔ یہاں جو تضلیل و تفسیق سے بڑھ کر تکفیر کے سلسلے شروع ہو چکے ہیں، اِس وحشتِ ایمان سوز سے اُن لاکھوں لاکھ سادہ لوح مسلمانوں کے ایمانوں پر بہت خوف محسوس ہوتا ہے جو آج بھی علما کو اپنا رہنما تسلیم کر کے سنیت کے تحفظ کی خاطر اُن کی ہر بات پر دینی جذبے سے عمل کے لیے تیار رہتے ہیں۔

جب کہ اِس بیچ بعض متشددینِ بے توفیق بلا امتیاز سب کو صلح کلی و بدمذہب بلکہ غصے میں مرتد و وہابی، فرعون و ابلیس اور کذاب و دجال تک کہتے پھریں گے تو اِن کا ایمان اَمرت پیا ہوا تھوڑی ہے کہ ہمیشہ امر رہے۔ عام مسلمانوں کے لیے ایسے علما ہدایت کن نہیں بلکہ نہایت بُرے اور گم راہ کن ثابت ہو رہے ہیں۔ حالیہ دھڑا دھڑ تضلیل و تفسیق بلکہ تکفیر کی مہم جوئی یہی سب ہے۔ ہمیں خوف ہے کہ اگر جماعت میں یہی سب رہا تو بعید نہیں کہ ایک دن خود ہم اپنے ایمانوں کے لیے فتنہ بن جائیں۔ اُس وقت ہمیں غیروں سے نہیں بلکہ اپنے آپ ہی سے اپنے ایمانوں کو بچانے کی ضرورت ہوگی۔ ہم سراپا فتنہ جو بن چکے ہوں گے۔

اِس پیمانے پر ساری دنیا کافر

ہمیں لفظِ مسلکِ اعلیٰ حضرت سے بیر نہیں، ہمیں لفظوں سے بیر ہو بھی کیوں، نہ خلافِ اعلیٰ حضرت موقف سے دل چسپی۔ ہم الحمدللہ مسلمان ہیں، صحیح العقیدہ سنی ہیں، فکرِ رضا ہماری پسند ہے۔ یہ ہمارا کل تعارف ہے۔ لیکن بحث آج عقیدت سے بڑھ کر ایمانیات اور کفریات میں داخل ہوگئی ہے جہاں ہم دینی اصولوں سے ہٹنے سے معذور ہیں۔ خود تحدید کردہ مسلکِ اعلیٰ حضرت ہی ایمان و کفر کا معیار ہو تب بھی کرۂ ارض کے اِس رُبعِ مسکون پر اُن لوگوں سے زیادہ اعلیٰ حضرت اور مسلکِ اعلیٰ حضرت کا نام لیوا، اُس پر عمل پیرا، فتاوی رضویہ پر بے تحاشا اعتماد رکھنے والا، بار بار حوالے دینے والا کون مل سکتا ہے جن کو آج مخالفینِ مسلکِ اعلیٰ حضرت قرار دیا جا رہا ہے۔ یعنی دعوتِ اسلامی، سنی دعوتِ اسلامی اور بالخصوص روائتی مسلکی اِدارہ جامعہ اشرفیہ اور اُس کے فرزندان، کارکنان، نمائندگان۔ اِن لوگوں کی آج تک شناخت بریلویت سے ہے، اِنہوں نے آج تک کام بریلویت کا کیا ہے، نام بریلویت کا لیا ہے۔ سنیت کی خدمت ہمیشہ بریلویت کے راستے سے کی۔ لیکن پھر بھی یہ سنی نہیں بلکہ صلح کلی ہو گئے، تو اِس کا مطلب یہی ہوگا کہ آج پوری دنیا کافر ہے اور کفار پر قیامت کا نزول تیار۔ اللہ تعالیٰ ہمیں گم راہ فرقہ بننے سے بچائے۔ خدا ہمیں صراطِ مستقیم پر گام زن رکھے اور اُسی پر موت دے۔ آمین۔